تعمیر حیات

پندرہ روزہ

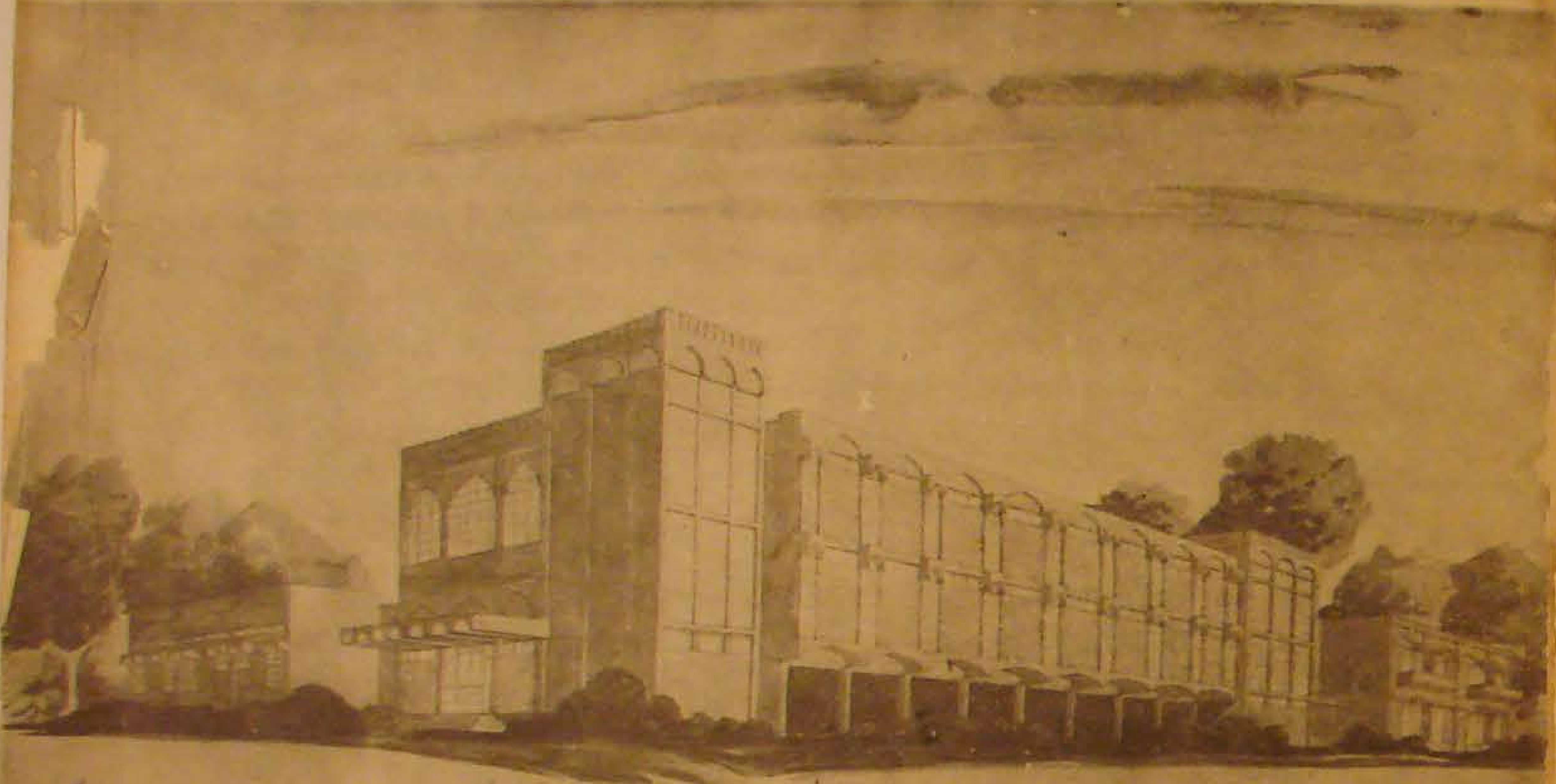

کتب خانہ ندوۃ العلماکی نئی عمارت کا مجوزہ خاکہ

LIBRARY BLOCK
NADWATUL-ULUMA

LUCKNOW INDIA

HOSTEL PROJECT NADWATUL-ULUMA
LUCKNOW - INDIA.

جدید دار الاقامہ کا مجوزہ نقشہ

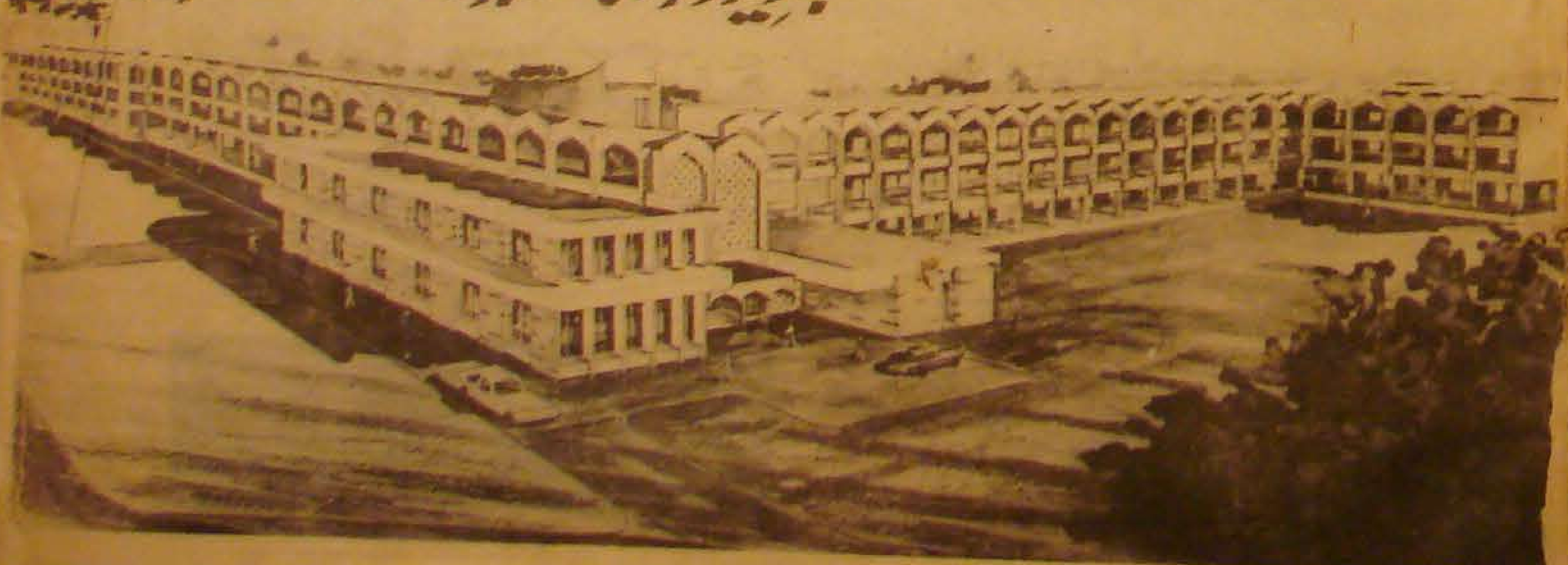

Regd No. LW/NP 56

Phone 22345 23747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مجمع بحار الانوار

(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لیے بے نظیر کتاب)

تالیف: ملک المحدثین علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی (المتوفی ۹۸۶ھ)

اس کتاب کے بارے میں تمام دنیا کے علماء اور ماہرین فن حدیث کا اتفاق ہے کہ یا اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، جو اپنی جامعیت اور فنی رعایتوں کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ الفاظ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی لغوی مشکلات اور دیگر مباحث کے لئے یہ کتاب گویا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں لغوی تحقیق اور فنی بحثیں ایسی مبسوط اور مستحسن طریقہ پر کی گئی ہیں جو طالب علم کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور محقق کے مرتبے کی تشنگی بھی بجھ جاتی ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلاد عربیہ کے علماء نے بھی اس کی عظمت اور اہمیت کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، قدر دانوں کی طلب بلکہ ان کے اصرار پر، اب خدا کا شکر ہے کہ نہایت آب و تاب اور عربی ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ اچھے کاغذ پر۔ پہلی بار۔ محدث شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ کے گرانقدر مقدمہ اور محقق لغات مولانا عبد الحفیظ بلیاوی کی تصحیح و تنقیح کے بعد۔ ۵ جلدوں میں، دائرۃ المعارف حیدر آباد نے طبع کر کے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری کر دی ہے۔

کتاب کے مجموعی صفحات ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہونے کے باوجود۔ نفع عام اور علم دین کی خدمت کے جذبہ سے۔ پورا سیٹ لینے والوں کے لئے اس کا ہدیہ صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپئے رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی تیل، نقلی کیپسول اور ٹین کے دھوکے سے ہوشیار!

نورانی تیل

درد۔ زخم۔ چوٹ۔ جلنے۔ کٹنے کی دوا

اب سنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیے۔

انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن، یو۔پی

ہند تیل

ہر قسم کے صاف، درد، چوٹ، زخم، موچ، جلنے، کٹنے ... فوری علاج ہے۔ اس کی مسلسل مالش کرنا ... تندرست و توانا بناتی ہے۔

تیار کردہ: ہند سی۔ بی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن یو۔پی

"تعمیر حیات" میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

شربت نزلہ

معمولی کھانسی، زکام اور نزلہ کے لئے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸

حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل

بہترین چائے کا قابل اعتماد مرکز

عباس علاء الدین اینڈ کمپنی

اسپشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپشل ممری	گولڈن ڈسٹ
ہوٹل مکسچر	فلاوری بی او پی

AA

TELEGRAM- CUP, KATTLY

PHONE No. 33222

دار العلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ

عالم اسلامی کا مشہور دینی و علمی مرکز

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام، علی سید المرسلین وسیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

دار العلوم ندوۃ العلماء عالم اسلام کا مشہور دینی و علمی مرکز ہے جو پچاسی سال سے علم دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ عالم اسلام کی اس مشہور دینی درسگاہ کا قیام ۱۳۱۵ھ میں حضرت مولانا محمد علی مونگیری رح خلیفۂ اعظم حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رح کے مبارک ہاتھوں عمل میں آیا۔ الحمد للہ ہر عہد میں یہاں سے ایسے فضلاء تیار ہوکر نکلے جنہوں نے وقت کی ضرورت اور عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق صحیح دینی عقائد و علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کی اور اسوقت بھی بفضلہ تعالیٰ اس کے فضلاء ہندوستان اور بیرون ممالک میں علمی و دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ یہ ادارہ موجودہ اخلاقی و دینی انحطاط کے دور میں بھی موثر علمی و دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ارکان میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے منتخب علمی و دینی اہم شخصیتیں شامل ہیں۔

ندوۃ العلماء کے گزشتہ عظیم تعلیمی اجلاس (منعقدہ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق نومبر ۱۹۷۵ء) جس میں دور دراز سے آئے ہوئے عرب اہل علم و اصحاب فکر حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی تھی، وہ بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کی ان خدمات سے بہت متاثر ہوئے اور فضلاء ندوۃ العلماء کی علمی و دینی سرگرمیوں اور کارگزاریوں کو سراہا۔

اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ تھائی لینڈ، ملیشیا، نیوزی لینڈ، ساؤتھ افریقہ وغیرہ کے طلباء بھی زیر تعلیم ہیں، ملکی و غیر ملکی طلباء کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، انمیں تقریباً تین سو غیر مستطیع طلباء کے وظائف (اسکالرشپ) پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپے صرف ہو رہے ہیں۔ حضرات مدرسین و اسٹاف کی تعداد ۸۰ سے زائد ہے۔ ہر سال جدید طلباء کے اضافہ کے باعث رہائش گاہ کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اکثی سال سے برابر تعمیری کام کچھ نہ کچھ جاری رہتا ہے۔ سالانہ مجموعی مصارف مع ضروری تعمیرات دس لاکھ روپے ہیں، ادھر چند برسوں سے روزافزوں گرانی اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا جو سلسلہ چل رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور ابھی کچھ عرصہ اور چلے گا۔

اس بات کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ جب ایک ایک فرد اور ایک ایک گھر اس گرانی سے کم و بیش متاثر ہے تو ان دینی اداروں کا جو عام مسلمانوں کے عطیات اور ان کی ہمدردی و تعاون کی بنیاد پر قائم ہیں اور جن کو سیکڑوں طالبعلموں کے اخراجات، قیام و طعام اساتذہ و عملہ کی تنخواہوں اور دوسرے کثیر مصارف کا ہر ماہ انتظام کرنا پڑتا ہے، کسقدر دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا جب اس کا اثر اکثر افراد پر پڑا ہے تو دینی اداروں اور مدرسوں پر اس سے کہیں زیادہ پڑا ہے، اس لئے کہ ان کی ذمہ داری کا بوجھ افراد سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف (جس کی اہمیت موجودہ دور میں روز روشن کی طرح عیاں ہے) ہمارے مسلمان بھائیوں کو زیادہ اہتمام اور فیاضی و دریادلی اور حوصلہ و ہمت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی خدمات میں اُن اہل خیر حضرات کا بڑا حصہ ہے جو اس اہم کام کو اپنی ذاتی ضرورت سمجھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً حسب استطاعت اعانت فرماتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس تعاون کو قبول فرمائے۔

اہل استطاعت حضرات سے خصوصیت کے ساتھ گذارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ اعانت فرماکر موجودہ مشکلات میں دار العلوم کی ترقی میں معاون ہوں، نیز بطور صدقہ جاریہ تعمیرات میں بھی حصہ لیں اور اپنے نام سے یا اپنے مرحوم اعزا کی طرف سے ایصال ثواب کے لئے طلباء کی رہائش گاہیں تعمیر کرائیں، نئے دار الاقامہ کے ایک کمرہ پر دس ہزار روپیہ صرف کا تخمینہ ہے، یہ کمرہ ۱۸ × ۱۶ فٹ کے ہیں اور ان کے سامنے ۸ × ۱۸ فٹ کا برامدہ ہے۔ ہر کمرہ میں چھ طلباء کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس جدید دار الاقامہ پر مصارف کا کل تخمینہ ۱۲ لاکھ روپے ہے۔

اس کے علاوہ ایک جدید دار الاقامہ (ہوسٹل) اور کتب خانہ اور اسٹاف کے رہائشی مکانات اور کتب خانہ وغیرہ کی فوری تعمیر کی ضرورت ہے جس کے نقشوں کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس طرح مدرسہ ثانویہ کی جدید عمارت کی تکمیل اور مسجد کی توسیع میں کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اس کا کام بھی مکمل کرنا ہے۔

یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر فلاح و بہبود ان کے اس دین سے وابستہ ہے جس کو لے کر حضور اکرم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے، مسلمان جسقدر اس حقیقت کی طرف توجہ کریں گے اور جس قدر دینی کاموں میں دلچسپی اور بلند ہمتی سے حصہ لیں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت و کامیابی کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم"

رمضان المبارک اور اس کے علاوہ مختلف اوقات میں بعض حضرات اساتذہ و سفراء دار العلوم کی مالی اعانت کے سلسلہ میں مختلف علاقوں میں تشریف لیجاتے رہتے ہیں۔ مقامی طور پر درد مند اہل خیر حضرات دلچسپی سے تعاون فرمائیں تو انشاء اللہ دار العلوم کی اعانت کا بڑا کام ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی توفیقات خاص سے نوازیں اور اپنے دین کی نصرت و حمایت کی دولت سے سرفراز فرمائیں۔

خاکسار

(مولانا سید) **ابو الحسن علی ندوی**

(ناظم ندوۃ العلماء)

زر اشتراک اندرون ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی سات روپیہ
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرون ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ شلنگ
ہوائی ڈاک سے، امریکہ و کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید ممالک ۲ ۱/۲ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

تعمیر حیات
لکھنؤ
پندرہ روزہ
شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۳ | ۲۵ فروری و ۱۰ مارچ ۱۹۷۶ء ـــ ۲۵ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ | شمارہ ۸-۹

اسحٰق جلیس ندوی

اسلام تغیر پذیر دنیا میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ مطالعہ اسلامیات (Islamic studies deptt) کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ سیمینار کا موضوع تھا "اسلام تغیر پذیر دنیا میں"۔ اس سے قبل ۲۶ تا ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ جس کا افتتاح صدر جمہوریہ نے کیا تھا اور شرکاء میں مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند بھی تھے۔

علی گڑھ کے سیمینار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں برصغیر کے چار مکاتب فکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سربراہ پروفیسر اے۔ ایم خسرو (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) ڈاکٹر مسعود حسین خاں (شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) شریک تھے۔ سیمینار کے مندوبین اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کو متعین موضوع پر ان حضرات کے خیالات سُننے اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کا موقع ملا۔

مندوبین میں ملک کے مختلف مقامات اور مختلف مسلک و خیال کے تقریباً ۸۰ علماء، فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی۔

سیمینار کا افتتاحی جلسہ سنیچر ۲۲ جنوری ۱۹۷۶ء کی صبح ۱۱ بجے مسلم یونیورسٹی کے وسیع کینیڈی ہال میں وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کی صدارت میں ہوا۔ خسرو صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اکبر الہ آبادی کی طرح عصر جدید پر طنز سے تغیر پذیر زمانہ کے چیلنج کا مقابلہ اور مسائل کا سامنا نہیں کیا جاسکتا، ہمیں حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور اصول دین کو متاثر کئے بغیر جتنی لچک پیدا کی جاسکے پیدا کرنی چاہیے۔ انہوں نے علماء اور قدیم دینی مدارس کو تغیر پذیر زمانہ اور جدید رجحانات کو سمجھنے اور علوم جدیدہ اور نئی تحقیقات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی، ساتھ ہی عصری علوم کے ماہرین کو اسلامیات سے واقفیت کو ضروری قرار دیا۔

خسرو صاحب کے صدارتی خطبہ کے بعد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) نے افتتاحی تقریر کی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں تغیر پذیر دنیا اور اسلام کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ زمانہ اپنی تغیر پسندی یا تازہ پسندی میں جتنا بدنام ہے اتنا بد نہیں۔ زمانہ ثبات و تغیر کے مرکب اور مجموعہ کا نام ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ زمانہ میں ہر لمحہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب زندگی کا نگراں اور محافظ ہے مذہب جائز تغیر اور نسل انسانی کے لئے مفید تبدیلی کا تو قائل ہے لیکن وہ ہر غلط اور صحیح تغیر کا ساتھ نہیں دے گا۔ اگر ہم مذہب کے متعلق یہ رویہ اپنائیں تو ہم اسے اس کے بلند منصب و مقام سے اُتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کی حیثیت دیدیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سیمینار کے منعقد کرنے والوں یا اس میں شرکت کرنیوالوں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات ہوگی کہ مذہب کو تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا درجہ دیا جائے۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ عہد جدید کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب تو مسئلہ اسلام اور عہد جدید میں مطابقت کا نہیں رہا بلکہ عہد جدید کو بچانے کا مسئلہ اہم ہے جو تیزی سے تباہی اور خودکشی کی طرف جارہا ہے دنیا کو ایسے عبقری افراد کی ضرورت ہے جو اسلام کی روشنی میں عہد جدید کی تاریکی کو دور کر سکیں۔ مولانا نے تطبیق کی ان کوششوں پر بھی تنقید کی جس میں قرآن میں ڈھلنے کے بجائے قرآن مجید کو اپنی خواہشات میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے اقبال رح نے اس شعر میں کہا ہے ؎

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی فکر انگیز اور پُر مغز تقریر کے دوران سامعین نے بار بار تالیوں کی گونج اور تحسینی کلمات سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ تقریر سیمینار کا صحیح رُخ متعین کرنے میں بڑی کامیاب رہی۔ (مفصل تقریر اسی شمارہ میں دی جارہی ہے) سیمینار میں مقالہ خوانی کی پہلی نشست ۲۲ جنوری کی شام کو فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج کی صدارت میں ہوئی۔

اس نشست میں ان حضرات نے اپنے مقالے پیش کئے، ڈاکٹر بشیر الحق بحری آبادی ندوی "جدید ہندوستان میں دینی رہنمائی کا مسئلہ"۔ مولانا سید حامد علی "موجودہ دور میں اسلام کی ضرورت"۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری "اسلام تغیر اور ثبات کے درمیان" پروفیسر احمد سورتی "اسلام ایک بدلتی ہوئی دنیا میں" (انگریزی)۔ ڈاکٹر اقبال احمد انصاری "معاصر دنیا میں ماہر اسلامیات کا رول" (انگریزی) ان مقالات پر سوالات و جوابات کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۶ء مقالات اور اس پر بحث و مباحثہ کی ۵ نشستیں مولانا قاری محمد طیب صاحب، بدر الدین طیب جی، پروفیسر علی محمد خسرو، مولانا تقی امینی، پروفیسر مقبول احمد، پروفیسر محمد شفیع ان مختلف حضرات کی صدارت میں ہوئیں۔

مختلف موضوعات پر ان حضرات نے اپنے مقالے پیش کئے۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مولانا محمد رابع ندوی، ڈاکٹر عبد الحق انصاری، مولانا سید احمد عروج قادری، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی، ڈاکٹر بدر الحسن عابدی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، ڈاکٹر نورنبی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، عبد العظیم اصلاحی، مولانا تقی امینی، سید جلال الدین انصر عمری، جناب عبد الحلیم ندوی، ڈاکٹر خالد رشید، پروفیسر نذیر احمد، جناب وحید الدین خاں، عابد رضا بیدار، ڈاکٹر سالم قدوائی ندوی، ڈاکٹر عطا کریم برق، مولانا ظفیر الدین مفتاحی، پروفیسر تیمور ڈورانٹ، انوار علی خاں سوز، پروفیسر انوار الحق حقی، ڈاکٹر اقبال انصاری ندوی، مولانا سید احمد پالن پوری، ڈاکٹر محمود الحق، پروفیسر مقبول احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، جناب اختر الواسع، ڈاکٹر انور معظم۔

سیمینار توقع سے زیادہ کامیاب رہا، لوگوں کی دلچسپی اور سامعین کی کثرت کی وجہ سے جب آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں جگہ ناکافی ہونے لگی تو سیمینار کی نشستوں کا نظم اسٹریچی ہال میں کیا گیا۔

(باقی آئندہ)

اسلام

عہد جدید کی رہنمائی کر سکتا ہے

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام "اسلام تغیر پذیر دنیا میں (Islam in a Changing world) اس موضوع پر ایک چار روزہ سمینار منعقد ہوا اس سیمنار میں ملک کے ممتاز علماء، فضلاء اور دانشوروں کے علاوہ برصغیر کے چار مکاتب فکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے سربراہ پروفیسر اے۔ ایم خسرو (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں (شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) بھی شریک تھے۔

اس سیمنار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ۲۲ جنوری ۸۲ء کو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے درج ذیل برجستہ تقریر کی۔ مسلم یونیورسٹی کا وسیع کینڈی ہال سامعین سے پُر تھا لوگوں کی بڑی تعداد نے کھڑے ہو کر تقریر سُنی، سامعین میں سیمنار میں آئے ہوئے ملک کے مختلف علاقوں کے مندوبین کے علاوہ جناب بدر الدین طیب جی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے سربراہ، اساتذہ اور طلباء بھی شریک تھے۔ مجمع نے کامل توجہ اور سکون سے اس تقریر کو سُنا اور تحسین کی۔ یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے دانیال احمد بھٹکلی ندوی نے قلمبند کی)۔

جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذہ جامعہ، فضلائے مجلس اور معزز حاضرین!

میں سب سے پہلے اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس سیمنار کے داعیوں کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے مجھے ایسی موقر مجلس کے افتتاح کے لئے جس کا ایسا سنجیدہ اور فکر انگیز عنوان ہے دعوت دی اور عزت بخشی۔

بڑی ذمّہ داری:

حضرات! یہ بڑی موزوں اور برمحل بات ہے کہ یہ سیمنار مسلم یونیورسٹی کے حلقے میں اور اس کے زیر سایہ منعقد ہو رہا ہے جس نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بدلتی ہوئی دنیا اور تغیر پذیر عہد کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ اور واضح طور پر نوٹس لیا۔ لیکن تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے والے اداروں اور تحریکوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، تغیر، انقلاب انگیزی اور تبدیلی کی ضرورت کا تسلیم کرنا آسان ہے اس سے کچھ ذمہ داریاں اس ادارے اور اس تنظیم پر نہیں پڑتی جو تغیر سے انکار کر لیتا ہے۔ مگر تغیر کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد ادارہ ہمیشہ کے لئے اس کا ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ حالات کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا رہے اور دیکھے کہ نئے تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار ہے یا نہیں؟

اس حیثیت سے مسلم یونیورسٹی پر اور اس کے بعد ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور کارکنوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ان دونوں اداروں کے ذمہ داروں کا یہاں ایک سنگم ہو رہا ہے۔ ان کو خود زمانے سے پہلے اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ ایک مرتبہ تغیر کو قبول کر لینے کے بعد پھر کیا وہ کسی جائز تغیر کو قبول کر لینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟

زمانہ ثبات و تغیر کا نام ہے:

حضرات آج کا عنوان ہے "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" اس کے دو جز ہیں، ایک تو "اسلام" اور ایک "تغیر پذیر دنیا"۔ میں ضرورت سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کے بارے میں اپنے ناچیز خیالات پیش کروں اور ہم آپ ایک کھلی ہوئی فضا میں کھلے ہوئے دماغوں کے ساتھ اس پر غور کریں۔ میں سب سے پہلے تغیر پذیر زمانے اور تغیر پذیر دنیا کو لیتا ہوں۔

> **زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی تغیر پرستی یا اقبالؒ کے الفاظ میں "تازہ پسندی" کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بد کم ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری کا نام ہے اور اس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن، مرکب اور مجموعے کا نام ہے۔**

جب کبھی اس کا تناسب بگڑ جائیگا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا تو زمانے کا یا سوسائٹی اور تہذیب کا مزاج بگڑ جائے گا ان دونوں تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے۔ زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کو بدلنا چاہیے، اس لئے کہ بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں وہ زندگی کا عین مزاج ہے اور زندگی کی تعریف ہے

"ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں ہے زندگی"

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پُر ثمر نہیں کہلایا جا سکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھو دے۔

نمو تغیر پذیری یا میں اس سے زیادہ محتاط الفاظ میں کہوں گا کہ تغیر پذیری تغیر کے بجائے آپ اس عمل کو ترقی و نمو کا نام دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ساتھ انصاف ہوگا اور آپ اس کو بلند تر مقام عطا کریں گے۔

زمانہ اپنے اندر مقابلے کی ایک طاقت رکھتا ہے ہم یہ تو دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں۔ لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء و عناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقاومت سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے اس کے لئے ایک خاص طرح کی خورد بینی کی ضرورت ہے۔ ایک دریا ہی کو آپ لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مثال ہو سکتا ہے۔ دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود، اپنے نام کے ساتھ اپنے حدود کے ساتھ اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ

ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ و فرات آج بھی دجلہ و فرات کہلائیں گے اور گنگ و جمن آج بھی گنگ و جمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ صرف تغیر و انقلاب کا نام ہے صحیح نہیں ہے۔ زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے اور بہاؤ بھی۔ اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھو دے گا۔

اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، شخصیتیں اور ہستیاں ہیں سب کے اندر یہ دونوں مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں ان دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہوتا ہے اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے:

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لیے یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے یہ کسی تھرما میٹر

کی تعریف تو ہو سکتی ہے کہ وہ،

> **درجۂ حرارت و برودت بتلائے یہ مرغ بادنما (Weather cock) کی بھی تعریف ہو سکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہو سکتی میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اُتار کر تھرما میٹر یا مُرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی رسید دیتا رہے، اکنالج (ECKNOWLEDGE اس کا اعتراف) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس کو قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔**

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائشیں رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے لیکن یہ محض ساتھ دینا یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے اور یہ غیر صالح تغیر ہے۔ یہ تخریبی رجحان ہے اور یہ تعمیری رجحان ہے۔ اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیروؤں کے حق میں کیا ہوگا؟ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (GAURDIAN) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔

گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو بھی ہستی اس کی اتالیقی میں ہے اسکے ہر صحیح غلط رجحانات کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرے۔ مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک ہی قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے ایک ہی طرح کی روشنائی ہے اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ مہر تصدیق ثبت کر دے۔

مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ اور ترغیب کے اور بعض اوقات مجبوراً تہدید کے ذریعہ بھی لیکن بے لاگ طریقے پر اپنا فیصلہ کرے گا اور اگر کوئی ایسی غلط دستاویز اس کے سامنے آئی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف وہ اس سے انکار کرے گا بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کے راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے۔ معلم اخلاق کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحان پر سرزنش کر دے یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کر دے۔ لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔

مذہب کی تاریخ کی بعض آزمائشیں:

مذہب کی تاریخ میں ہمیں بعض آزمائشیں اور بعض وقفے نظر آتے ہیں۔ جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اور زندگی کا ساتھ چھوٹ گیا ہے یا جس کو ہم کہا کرتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے دماغوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اور زندگی کی حرکت پذیری یا حرکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے وہاں مذہب سے زیادہ پیروان مذہب اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو مذہب کے اعلیٰ اصول عملی زندگی میں جاری اور ساری کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ یہ مذہب کی کوتاہی نہیں کہ وہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا لیکن چونکہ مذہب اور پیروان مذہب کا ایسا مستحکم رشتہ اور نازک تعلق ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت کم نگاہیں فرق کر سکتی ہیں کہ یہ کوتاہی مذہب کی ہے یا پیروان مذہب کی۔ تاہم ایک عظیم ادارے اور ایک عظیم تحریک کے علمبردار حقیقت پسندانہ، ناقدانہ اور مذہبی، علمی اور گروہی عصبیتوں سے علیحدہ ہو کر تاریخ کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام بحیثیت اصول زندگی اس کا ذمہ دار نہیں تھا اور اس کے اندر کوئی ایسا نقص موجود نہیں تھا جو اس کو زندگی کا ساتھ دینے اور اس کے مسائل حل کرنے سے باز رکھے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب:

انسانوں کی پرانی کمزوری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں، جب بہت سے مسلمانوں سے قرآن مجید کی روشنی میں مسائل حاضرہ کے حل کرنے اور اپنی محنت و ذہانت سے قرآن مجید کے رہنما ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان ایسی مطابقت پیدا کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے، جس سے نہ قرآن مجید کے اصولوں کی خلاف ورزی ہو اور نہ زندگی کے رواں دواں قافلہ سے پچھڑ جانا پڑے تو وہ اپنے قصور کا اقرار کرنے کی بجائے قرآن مجید پر زندگی کا ساتھ نہ دے سکنے کا الزام لگاتے ہیں، یا مخالفین یہ تاثر دیتے ہیں کہ قرآن مجید معاذ اللہ ناقص ہے اس لئے کہ وہ ان کی ہر خواہش اور ہر ضرورت کے لئے سند جواز مہیا نہیں کرتا، علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

بعض لوگ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر خود قرآن مجید کو اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں اور بے اصولیوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کی ایسی تفسیر کرنے لگتے ہیں جس سے ان کی غلط زندگیوں کا جواز نکلے وہ اپنے کو قرآن مجید کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے قرآن مجید کو اپنے فکر و عمل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے مقدمہ تفسیر میں اپنے مخصوص ادیبانہ اور بلیغ انداز میں اس صداقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن مجید کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انہوں نے اس کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتارنے کی کوشش کی تاکہ وہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے"۔

باصلاحیت افراد کی کمی:

وہ سارے وقفے جس میں ہمیں مذہبی حلقے پر جمود طاری نظر آتا ہے یا پیروان مذہب کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ان عبقری شخصیتوں کے فقدان یا کمی کا دور ہے جو زمانے کے چیلنج کو قبول کر کے مذہب کی موثر نمائندگی کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے جس دور میں بھی مذہب کی بہتر نمائندگی ہوئی اسلام اور شریعت اسلامی پر معاشرے میں کبھی بھی بے اعتمادی نہیں پیدا ہوئی۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں زمانے کی سطح سے بلند ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت اور عبقری شخصیت سے اپنے دور کے فتنوں کا سدّ باب، اپنے زمانے کے نئے پیدا شدہ نئے مسائل کے حل اور مذہب کی طاقتور نمائندگی کا فریضہ نہایت کامیابی سے انجام دیا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اس دور میں پیدا ہوئے جب ان کی ضرورت دین اور زمانے کو تھی انہوں نے اسلامی شریعت و قانون کو منقح شکل میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کی بڑھتی ہوئی وسعت اور مختلف اقوام کے اسلام میں داخل ہونے سے پیدا شدہ مسائل کو حل کیا بعد کے دور میں امام ابو الحسن اشعریؒ اور امام غزالیؒ جیسے ذہین لوگ آئے اور انہوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کیا جو ان کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ آج وہ شخصیتیں پیدا نہیں ہو رہی ہیں جو مذہب کا دفاع اور اس کو درپیش ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں۔

آسان اور پُر پیچ:

حضرات! اگر آپ اس انداز سے دیکھیں تو بات بہت آسان اور قابل فہم ہے لیکن اگر صرف منطقی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مسئلہ بنانا چاہیں تو اچھا خاصا معمہ بن سکتا ہے۔ بات بہت سادہ ہے اور بہت آسان ہے اور بات بہت مشکل اور پُر پیچ ہے۔ سادہ اس طرح ہے کہ پہلے آپ زمانے کی حقیقت کو سمجھ لیں کہ زمانہ اسی طرح تغیر پذیر نہیں کہ اس کی سرشت کا نظام اخلاقیات ساتھ

دے سکتا ہے اور نہ کوئی نظام فکر۔ زمانے کی حقیقت ہم سمجھیں اور زمانے کا جو اصل مقام ہے اس کے ادراک کی کوشش کریں اور اس کے ساتھ ہم اسلام کو سمجھیں اور اس کا گہرا مطالعہ کرکے دیکھیں کہ قرآن مجید میں رہنمائی کے کیسے ابدی اصول دئے گئے ہیں۔ اس میں زندگی کے تغیر کا کتنا اعتراف کیا گیا ہے اور عقل و فہم سے کام لینے کی کیسی دعوت دی گئی ہے۔ ہم دیکھیں کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے جن پر یہ پہلی ذمہ داری عائد ہوتی تھی اپنے زمانے کے نظاموں اور تہذیبوں کا مقابلہ کرنے اور اس کا بدل تلاش کرنے کی کس خوبی اور کامیابی سے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

عہد جدید کا ساتھ دینا کیا معنی میں اس کو اسلام کی پوزیشن سے فروتر بات سمجھتا ہوں۔ اسلام تو عہد جدید کی رہنمائی کر سکتا ہے اور وہ ہر جدید عہد کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عہد جدید خودکشی پر آمادہ:

اسلام صرف عہد جدید کے تقاضوں ہی کو پورا نہیں کرتا بلکہ عہد جدید کو راہ پر لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عہد جدید کس مہلک غار کی طرف جارہا ہے؟ کس طرح خودکشی پر آمادہ ہے؟ اور انسانیت کے لئے پیام موت بن رہا ہے؟ نسل انسانی کی افادیت کے خلاف خدا کی عدالت میں ثبوت پیش کر رہا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟ کیسے کیسے تخریبی رجحانات اس میں کام کر رہے ہیں؟ اسلام اپنے ان اصولوں کے ذریعہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں خواہ وہ اخلاقی ہوں یا تمدنی خواہ افراد کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ان کی خارجی زندگی سے، ان اصولوں کے ذریعے عہد جدید کے نہ صرف جائز تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے بلکہ عصر جدید کو اس تباہی سے بھی بچا سکتا ہے جو تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔

اب مسئلہ عصر جدید کا ساتھ دینے اور نہ دینے کا نہیں رہا اب تو عصر جدید کے بچانے کا مسئلہ سامنے آیا ہے، اب تو عہد جدید کی بات کرنے والوں عصرِ جدید کے قصیدہ خوانوں، عہد جدید کی دہائی دینے والوں اور عہد جدید کے نام پر ایسے سمینار بلانے والوں کا ہے وہ بھی رہینگے یا نہیں رہیں گے؟ اس نقار خانے میں ان کی آواز سنی نہ جائے گی، جہاں صرف پیٹ اور نفس امارہ کی پرستش ہوتی ہو، جہاں صرف دو حقیقتیں تسلیم کی جاتی ہوں کہ دنیا میں صرف دو حقیقتیں زندہ ہیں، ایک دولت، دوسری قوت، کیا اس زمانے میں یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابل غور ہوگا اور کیا انسان اس موڈ میں ہوں گے کہ کوئی سنجیدہ بات ان سے کہی جاسکے؟ یہاں تو صرف ایک نعرہ ہوگا کہ بہتی ہوئی گنگا ہے اپنا اپنا ہاتھ دھولو اور اپنی اپنی جھولی بھر لو، کوئی اخلاقی حدود کوئی بلند معیار کوئی انسانی خیر خواہی کی بات اور تہذیب کو بچانے کا مسئلہ قابل فہم نہیں رہیگا۔ لوگ اس موڈ میں نہیں ہوں گے۔

اب تو اسلام کے بجائے عہد جدید کو بچانے کا مسئلہ زیادہ اہم ہے آپ اس عہد جدید کی خبر لیجئے جو اتنا بدمست ہو چکا ہے کہ کوئی سنجیدہ بات سننا نہیں چاہتا۔ آپ اسلام کی طرف سے اطمینان رکھئے وہ ہر عہد جدید اور سب جائز تقاضوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس سے زیادہ انصاف پسند کوئی نظام نہیں۔ جب بھی کوئی مظلوم آواز یا انسانی فریاد بلند ہوئی تو اسلام نے سب سے پہلے اس کو تسلیم کیا اس نے ہمیشہ عقل انسانی کو سرگرم کار رہنے کی دعوت دی۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور عربی مدارس کے لئے چھٹی ہے۔ جمعہ کی چھٹی ہو یا اتوار کی چھٹی لیکن عقل انسانی اور عقل ایمانی کو کبھی چھٹی نہیں۔ اس نے کہا کہ اہل علم کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ضرورت ہے اور سخت سے سخت معیار زندگی گزارنے کے لئے اپنے کو تیار رکھنا چاہئے۔

غلط تشریح سے غلط فہمیاں:

بہت سی غلط فہمیاں غلط تشریح سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے حضرت علیؓ کا یہ مقولہ ہے کلموا الناس علی قدر عقولھم أتریدون ان یکذبوا اللہ ورسولہ۔ لوگوں کی عقل کے مطابق بات کرو دینی حقائق کو اس انداز میں پیش کرو کہ ذہن اس کو قبول کرے۔ یہ مسئلہ صرف الفاظ کا نہیں بلکہ اسلوب، طرز فکر اور طریقۂ بیان کا بھی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔ خدا اور رسول کی تکذیب اس لئے نہیں کی جارہی ہے کہ خدا اور رسول کی باتیں زمانے کے حقائق کے خلاف ہیں بلکہ اس لئے کی جارہی ہے کہ اس کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے، مسئلہ تشریح و تفصیل کا زیادہ ہے بہ نسبت اصل حقیقت کے۔

اسلام تغیر پذیر دنیا میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ یہ مقام کوئی ایسا نہیں کہ وہ آپ سے رحم کی درخواست کرے تو اس کو باقی رہنے دیا جائے۔ میں اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں بلکہ زندگی اسی کی نگرانی و رہنمائی میں صحیح راستے پر چل سکتی ہے۔

مذہب اور تہذیب: اس موقع پر یہاں ذہن میں تہذیب کا تصور آتا ہے۔ یہ ایک مسیحی تخیل ہے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک گزشتہ تہذیب کا نام ہے۔ LEGACY کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلام پر لکھنے والے مصنفین LEGACY OF ISLAM. کا عنوان دیتے ہیں۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں، ایک ادارے کے ترجمان کی حیثیت سے کہ اسلام ایک تہذیب ضرور رکھتا ہے لیکن وہ محض ایک گزشتہ تہذیب کا نام نہیں ہے۔ تہذیب کے لئے ہم جانتے ہیں کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہزار برس پہلے کی تہذیب، پانچسو برس پہلے کی تہذیب کا اس بدلی ہوئی دنیا میں کوئی جواز ہے لیکن مذہب صرف اخلاقی قدروں اور تہذیب کا نام نہیں وہ تو حقائق، عقائد اور ایمانیات کا مسئلہ ہے وہ عبد و معبود کے باہمی رشتے کا مسئلہ ہے۔

اگر اسلام کا یہ دائرہ ہے تو اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے کہ سانچے بدل جائیں گے تو وہ ان سانچوں میں فٹ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مغربی مصنفین غلط بحث کرتے ہیں۔ اسلام تو ابدی حقائق و عقائد کا نام ہے زندگی چاہے کتنی ہی بدل جائے ان ابدی حقائق و عقائد کے لئے جگہ اور گنجائش ہے اور پوری زندگی اس کے سائے کے نیچے آنی چاہئے۔ اگر نہ آئے گی تو پھر اس زندگی اور سوسائٹی کے اندر ساری خرابیاں پیدا ہوں گی جو ہم مغربی تمدن میں دیکھ رہے ہیں اور اس کا کوئی حل وہاں کے بڑے سے بڑے مفکروں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

خط و کتابت
کرتے وقت
حوالہ
نمبر خریداری
ضرور تحریر کریں۔

تعمیر حیات میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیں

”علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ اصل سرچشمہ وہی ہے“

علی گڑھ سیمینار میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اختتامی تقریر

مہارت اور اختصاص ضروری ہے!

حضرات! مجھے بڑی مسرت ہے کہ علوم اسلامیہ اور دینی موضوعات سے اور عصری درسگاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ سیمینار اس کی دلیل ہے ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے، نہ کبھی مرکوز رہا ہے اور نہ کبھی مرکوز ہو سکتا ہے، اور ایسا ہونا بھی کچھ اچھا نہیں، اس طبقہ کے لئے خواہ یہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور محنتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں علمائے دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ نہیں ہے۔ کلرجی (clergy) اور پریسٹ ہڈ (Priest hood) کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے، اس کا دنیائے اسلام میں کہیں وجود نہیں، اور اگر ہمارے بعض اہل قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سمجھے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں، مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں "رجال الدین" کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے جو تقریباً اسی معنی میں ہے جو مسیحی دنیا میں پریسٹ ہوڈ (Priest hood) کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لئے محتاط مصنفین نے جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ عرض کروں گا، اور اتنا اضافہ کروں گا کہ کلرجی (clergy) اور پریسٹ ہڈ (Priest hood) اسلام میں نہیں ہے لیکن ایکسپرٹ (EXPERT) اور اسپیشلسٹ (Specialist) کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ ایک آدمی کے لئے ہمہ داں ہونا عملاً ناممکن ہے۔ یورپ میں بھی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب وہاں یہ تقسیم کار ہوئی اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہو گئے اور اس کی کوشش ان لوگوں نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں اتھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں۔ جہاں تک مجھے علم ہے یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے وہاں کسی علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعید متعلقات کے متعلق بغیر کسی تواضع و انکسار کے اور بغیر کسی شرم و ندامت محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، یہاں تک کہ لٹریچر، ادب و لسانیات میں بعض اوقات گرامر و قواعد کی بحث آتی ہے تو بعض دیانتدار یا جن میں زیادہ احساس ذمہ داری ہے کہہ دیتے ہیں کہ یہ گرامر کی چیز ہے اس پر ریسرچ کرو ۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اور آپ اس کو نظری اصول کے تحت تسلیم کرلیں کہ ہماری آئندہ دلچسپیاں اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہوں

معیار کیطرف توجہ کی ضرورت ہے: مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہمسفر ہوں، ہمسفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، آپ اس کو تنقیص یا تعریض پر محمول نہ فرمائیں۔ پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں، اور آپ میں سے بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہوں گے بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰۔۴۰ برس اس صحرا نوردی میں گزرے ہوں گے کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جارہا ہے مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلا سے بھی سنا وہاں بھی اورینٹل ازم کا جہاں تک تعلق ہے یعنی مشرقی مباحث پر لکھنے کا اس کا معیار وہاں بھی فروتر ہو گیا ہے، اور وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گزشتہ نسل کے فضلاء میں تھی اسکی کمی ہے، اس کے پیچھے بہت سے عوامل اور Factors کام کرتے ہیں کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز! ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں۔ انہوں نے اورینٹل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہونچا دیا تھا، فزکس اور ٹکنالوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظری مباحث کا تعلق تھا اورینٹل ازم کو جو یورپ میں اعزاز حاصل تھا مستشرقین اور ان کی کتابوں کی جس طرح قدر ہوتی تھی وہ کم علوم کو حاصل تھی یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل یا Factor کام کر رہا تھا ہم کو خوشی ہونی چاہیے کہ اب وہ فیکٹر باقی نہیں رہا وہ تھا استعمار مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ممالک بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مسلمانوں کے زیر اثر تھے اُن پر مغرب کی للچائی ہوئی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔

استعمار نئی نئی نو آبادیاں قائم کرنا چاہتا تھا اس لئے وہاں کے قوم کی مزاج اور خصوصیات اور انکی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف کی ضرورت تھی اس کے لئے مستشرقین ایک ہراول دستہ (POINEER) کا کام کرتے تھے۔ ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا۔ یہ Factor عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا معاشی عامل Factor تھا اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے۔ معاشی ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ وہ انعام ملنا مشکل ہے جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق! تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت اس پر طاری ہوتی تھی۔

میں یہ بات ایک ایسی جگہ بیٹھ کر عرض کر رہا ہوں کہ یہاں اس کا کہنا بہت زیادہ خوشگوار نہیں ہے، میں کسی خاص مدرسہ یا کسی خاص دانشگاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں، یہ میرا عام مطالعہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بہت سے حضرات میری تائید کریں گے۔ اور سب جگہ یہ محسوس کیا جارہا ہے سب سے بڑا المیہ اور بدقسمتی جس کی کوئی چیز تلافی نہیں کر سکتی وہ یہ کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ اس دنیا کے مزاج علم کی ایک لگن تھی اور وہ آج مفقود ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کتاب علمائے سلف جو انہوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسے موجزن تھا اور آج اس میں کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے۔ یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاسیات معاشیات، ادبیات اور اخلاقیات سے بھی ہے۔ اس کے پورے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے، لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شرکاء کار اور ہم سفر ضرور اس کو تسلیم کریں گے اور سب سے پہلے منطقی میں اقرار کرنے کے لئے تیار ہوں کہ علم سے عشق، تحصیل علم پر پروانگی کی کیفیت علم و تحقیق کا ایسا جنون کہ ان کو کھانے پینے کپڑے کا ہوش نہیں، اور یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔ علماء سلف کے واقعات کو چھوڑ دیجئے اس علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے، مولانا لطف اللہ علی گڑھی ان کے اس عشق کو دیکھئے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے۔ اس وقت کے عربی مصنفین کے یہاں لین Lane جس کا عربی لغت میں بلکہ انگریزی میں سند تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ ہم عربی ادب کے شائقین جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں اور ایک جگہ پر زیادہ مواد دیکھنا چاہتے ہیں، ہم بھی اس کے محتاج ہیں کہ لین Lane کی لغت سے فائدہ اٹھائیں میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ اس لغت کا کچھ حصہ تیار کر رہا تھا تو مہینوں گزر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ترتیب: سید سلمان حسینی ندوی

تزکیہ ہے دِل کا شرطِ اوّلیں

اولیاء اللہ کی صحبت اور ان سے حقیقی استفادہ کے چند لمحات بعض اوقات سالوں کی پرخلوص عبادت و ریاضت پر بھاری ہو جاتے ہیں۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ عبادت و ریاضت سے تقشف و تدین اور دنیا سے بے رغبتی تو پیدا ہو سکتی ہے مگر بے نفسی، ایثار، فنائیت اور انانیت کا ازالہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مرد کامل کے پاس بیٹھ کر اپنے ظلم و جہل کو دیکھے اپنی حقیقت پہچانے اور اپنے احساس کمال اور فضیلت و تقوی کے خیال کا شیشہ چکنا چور کرے۔

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

اور واقعہ یہ ہے کہ اس علاج کے محتاج علماء عابدین و زاہدین اور مسند نشین شیوخ، عام سطح کے لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

جو اپنے اندر ابتدا ہی سے کوئی کمال نہ دیکھ رہا ہو اس کے لئے کمال کی نفی کرنا بہت آسان ہے لیکن جن کے قلوب میں انکے دینی علمی اور خانقاہی مقام نے فضل و کمال کا احساس پیوست کر دیا ہو ان کے لئے اپنے فضل و کمال کا انکار کر نا کر دل کے روئیں روئیں سے عجز، فنا اور "انا" کے انکار کی صدا بلند ہونے لگے بڑا دشوار گذار اور جاں گسل کام ہے ؎

دل سے جو کہتا ہے میں کچھ بھی نہیں
بس وہی ہے مرد کامل بالیقیں

ہماری خوش بختی تھی کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی بدھ کی شام کو الٰہ آباد سے لکھنؤ تشریف لائے اور مدینہ منیشن گولہ گنج میں قیام فرمایا۔ جمعرات کو مغرب کے بعد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لائے اور عشاء کی نماز تک تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مجلس رہی۔

حضرت مولانا اس دور میں ان صوفیاء چشتیہ و نقشبندیہ کا نمونہ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اسلام پھیلایا۔

محبت، خلق، شفقت و ہمدردی، سوز دل، دعوت الی اللہ، اتباع سنت اور تحمل و صبر یہ حضرت مولانا کے بنیادی صفات ہیں ان کا اصول یہ ہے کہ کھینچنے والے کو بھی پیار کرتے ہیں اور قریب ہونے والوں اور محبت کرنے والوں پر ہزار بار نثار ہوتے ہیں۔ فنائیت بے نفسی اور ایثار ان کا شیوہ ہے۔

حضرت مولانا نے دس سال اپنے شیخ حضرت مولانا بدر علی صاحب کی خدمت میں گذارے۔ اپنے یہاں سے ۹-۱۰ دس میل دور غیر ہموار اور جنگل کا راستہ طے کر کے پیدل حضرت کی خدمت میں آتے اور تربیت حاصل کرتے۔ حضرت مولانا شاہ بدر علی صاحب حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ بڑے متبع سنت اور پابند شریعت تھے۔

فرماتے تھے، کہ جو بات خلاف سنت میرے اندر دیکھنا بتا دینا، اتباع سنت کا بڑا خیال رہتا تھا، وہ دوسرے صفات و کمالات کے ساتھ ساتھ اس صفت میں اپنے شیخ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب کا صحیح اور مکمل عکس تھے۔ بخاری شریف ان کو پوری یاد تھی۔ ۱۸ سال کی عمر میں ازہر تشریف لے گئے، وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد شام و عراق گئے۔ مصر و شام و عراق میں ۲۸ سال گذارے۔ ایسے جہاندیدہ باکمال ہونے کے باوجود اپنے گوشہ گمنامی کو پسند کیا، اور ایک عام دیہاتی کی سی زندگی گذار دی، لیکن ایسا جانشین چھوڑ گئے کہ جس سے آج رشد و ہدایت اور تربیت و اصلاح کے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔

اپنے شیخ کا یہی اثر تھا جو حضرت مولانا کی زندگی میں نئے رنگ و روغن کے ساتھ اور پوری آب و تاب کے ساتھ آیا، اور ان کی ساری زندگی کو سنت کے رنگ میں رنگ دیا۔

حضرت مولانا اپنے دور جوانی میں جبکہ ان اطراف میں تبلیغی سلسلہ شروع بھی نہ ہوا تھا بسا اوقات چار پانچ ساتھیوں کو لے کر گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے، اپنے ساتھ تھیلہ میں بھنے چنے اور روٹی رکھ لیتے اور اس پر گذارہ کر کے ایک داعیانہ جذبہ اور وارفتگی کے ساتھ گاؤں گاؤں کی خاک چھانتے۔ لوگوں سے ملتے اور ان کو محبت و شفقت کے ساتھ اور حکیمانہ طرز دعوت کو اپنا کر مسجد میں جمع کرتے ان سے دین و ایمان کی باتیں کرتے خدا تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے۔ اس اخلاص سے بھرپور دعوت کی مقناطیسی کشش سے دیکھتے دیکھتے پوری پوری بستیاں ہدایت پا جاتیں۔

ایک مرتبہ چندریا نامی گاؤں میں تشریف لے گئے، وہ خان زادوں کی بستی تھی، سب دین سے بالکل بیگانہ تھے، آپ ایک مسجد میں داخل ہوئے، مغرب کا وقت تھا صرف ایک صاحب بیٹھے تھے، نماز پڑھ کر ان سے اس انجان داعی نے بات کی، اور لوگوں کے پاس جا جا کر دعوت دی، عشاء کی نماز میں توفیق الٰہی سے ۳۰-۳۵ آدمی آ گئے، عشاء کی نماز کے بعد تقریر کی، اللہ تعالیٰ نے اس میں وہ اثر پیدا کیا کہ نماز فجر میں ۷۰-۷۵ آدمی آئے اور نماز فجر ادا کی۔

ان خان زادوں نے حضرت مولانا سے درخواست کی، کہ کھانا ہمارے ہاں کھائیے حضرت نے فرمایا، کہ آپ لوگ سود لیتے ہیں، میں کیسے آپ کا کھانا کھا سکتا ہوں، زخم خوردہ تو تھے ہی، ساری دستاویزیں اٹھا لائے اور مولانا کے پاس ڈال دیں کہ آپ فرمائیں ان کو جلا دیں یا پھاڑ ڈالیں، حضرت مولانا نے فرمایا نہ پھاڑو نہ جلاؤ، اپنا اصل روپیہ لے لو اور سود کی رقم نہ لو۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سے ان دور افتادہ اور غیر معروف گاؤں اور بستیوں میں کام لیا جہاں ان سے پہلے اور داعی نہ پہونچے تھے، مولانا کے خمیر میں دعوت و تبلیغ کا مادہ ہے ہمیشہ انہوں نے داعیانہ زندگی گذاری، اور دعوت کے کام کے لئے دامے درمے قدمے ہمیشہ پیش پیش رہے۔

توحید اتباع سنت، رد شرک و بدعت یہی وہ موضوع تھے جن پر مولانا جگہ جگہ تقریریں کرتے اور نتیجۃً کبھی سخت تکلیفیں اور مشقتیں بھی اٹھانی پڑتیں، یہی دعوت کا کام ہے، جو مولانا کی غذا ہے اور اسی سے ان کی حیات ہے۔ اگر ان کو ہر چیز مہیا کر دی جائے اور ان سے کہا جائے کسی سے معارف و حقائق کی باتیں نہ کیجئے اور دعوت نہ دیجئے تو وہ زندگی باقی نہیں رکھ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کے ہاتھ پر بہت سے نام کے مسلمانوں کو جو اسلام سے اتنا دور تھے جتنا کہ کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے صحیح معنی میں مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائی، اور پھر وہ صادق مسلمان ہوئے اسکے علاوہ کتنوں کی زندگیاں سدھریں، کتنے تائب ہوئے، کتنے معارف آگاہ ہوئے کتنے غلط افکار اور غلط فلسفۂ حیات کے مارگزیدہ شفایاب ہوئے، ان کی تعداد کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

آج بھی ان کی زبان سے معارف و حقائق کے ایسے بیان سننے میں آئے ہیں جو کبھی حافظ وردمی سے سنے گئے تھے۔

مولانا کی کسی بات میں تکلف اور تصنع نام کو نہیں ہوتا کیونکہ جو اس لئے بول رہا ہو کہ خدا اُسے بلوا رہا ہے اس کے بول میں غیر اللہ کی آمیزش کیسے ہو سکتی ہے۔ مولانا کے بیان میں سادگی کے ساتھ عجیب تأثر اور انفعال کی کیفیت پائی جاتی ہے اور جب وہ شعر پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے سمندر میں غوطہ زن ہیں اور سامعین سطح آب پر بلبلوں کی ہست و بود کا نظارہ کر رہے ہیں اور نغمہائے عرفان کے ساز سے اپنے کان آشنا کر رہے ہیں ان کی مجلس میں بیٹھنے والا یہی چاہتا ہے کہ یہ مجلس ختم نہ ہو اور مجلس سے اٹھتا ہوا پڑھتا ہے ؎

سیر گل خوش نہ دیدیم و بہار آخر شد

ایسا کلام پھر نہ سنا اس سخن کے بعد
مجذوب یعنی خواجہ عزیز الحسن کے بعد

حضرت مولانا کے کلام میں اس عجیب البیلی سادگی کے ساتھ ادب عالی کے وہ جواہر پارے ہیں جس کا حسن اس کی آمد، روانی اور رنگا رنگ موزونیت میں ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ ان کا پورا دیوان جو ہزاروں شعروں پر مشتمل ہے کسی غور و فکر، ذہنی کاوش اور دماغی کوشش کا نتیجہ نہیں، وہ ابر کا برسنے والا ٹکڑا ہے جس کو ان کے قلب مزکّی کی جولانیاں برسا دیتی ہیں اور پے بہ پے کلام ایک عارفانہ موزونیت میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

اس حقیقت کا مشاہدہ اس وقت کھلی آنکھوں ہو جاتا ہے جب مولانا اپنے اشعار خود پڑھتے ہیں، وہ پڑھتے کیا ہیں، ایسا سرمدی ساز چھیڑ دیتے ہیں جس پر ہزاروں مجازی ساز قربان۔ اس ساز کا سننا صرف کان کے حصہ میں نہیں آتا آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور قلب میں جو احساس ہوتا ہے زبان اس کو ادا نہیں کر سکتی۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا عملی مشاہدہ یہیں ہوتا ہے۔

مولانا کا بیان اور خصوصی مجلسیں بھی نرالی ہوتی ہیں۔ وہ کسی ایک سے گویا تخاطب فرماتے رہتے ہیں اور حقیقتاً سب سے فرماتے ہیں لیکن انکی عمیق فراست اور عارفانہ دور اندیشی ایک ایک کے امراض کا علاج بتاتی چلی جاتی ہے۔ ایک مجلس میں کبھی کئی کئی موضوع اثناء کلام میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ان کے

بیان میں بے ربطی محسوس نہیں ہوتی اور فراست کا عالم یہ ہے کہ کتنوں کی دکھتی رگ پکڑ لی جاتی ہے اس کا مشاہدہ کتنی بار ہوا کہ ایک نیا شخص حاضر ہوا جس کو حضرت نہ جانتے تھے نہ اسکے احوال سے واقف تھے لیکن اس کے کسی اہم مرض کی طرف عام خطاب میں اس طرح توجہ دلائی کہ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ یہ اشاروں کنایوں میں کیا کہا جا رہا ہے اور پھر یہ دیکھا جاتا کہ آنے والا ندامت اور خوفِ خدا کا نشتر دل میں لیجاتا اور توبہ کی توفیق پاتا۔

مولانا کی مجلسوں سے تربیت و اصلاح اور ہدایت و ارشاد کا بڑا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ خدا تعالیٰ اس سلسلۂ رشد و ہدایت کو تا دیر قائم رکھے۔ اگرچہ،

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

لیکن . . . اس میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔

ساقی آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو اس کے جام و مینا ہی سہی۔ ان چند دنوں میں کئی مجلسیں رہیں۔ جن میں سے آج ہم پہلی مجلس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ہم کیونکہ حضرت مولانا کے الفاظ بعینہٖ قلم بند نہ کر سکے، اشارات کی مدد سے حضرت مولانا کی بات ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

بروز جمعرات ۱۶ دسمبر بعد مغرب پونے سات بجے سے پونے آٹھ بجے تک برمکان مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا،

"اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ جہاں کہیں کسی اللہ والے کا تذکرہ سنا اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جن بزرگان دین کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے بڑی محبت کا معاملہ فرمایا۔"

فرمایا:- "ابتداءً ایک شیخ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت مکمل یکسوئی اور انقطاع کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب رسوخ کسی قدر پیدا ہو جاتا ہے پھر شیوخ کی تعداد نہیں ہوتی۔ جہاں نفع دیکھا نشیب زمین بن کر حاضر ہوئے اور استفادہ کر لیا"

تدریج کی افادیت اور اس کے علمی ثمرات کو سمجھانے کے لئے بطور مثال فرمایا:-

"ایک بار خوب زور دار بارش ہو جائے پھر دو مہینہ بارش نہ ہو تو فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ تدریج حصول نافع ہوتا ہے۔"

تدریجی کام سہل بھی ہوتا ہے اور ثابت و دائم بھی خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

جو آسان سمجھو تو ہے عشق آسان
جو دشوار کر لو تو دشواریاں ہیں

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے راہ آسان ہی رکھی ہے فرمایا کہ،

"اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بہت ہیں۔" ان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔" لیکن بندہ توجہ نہیں کرتا۔

فرمایا:" علماء دعوت تو دے لیتے ہیں کیونکہ محض علم معلومات تو دے سکتا ہے لیکن معلوم تک پہونچا نہیں سکتا۔ ہاں عمل کر لینا صوفیہ کا کام ہے۔"

کیونکہ ان کی توجہ عمل ہی کی طرف رہتی ہے وہ جو جانتے ہیں اس سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جو کر لیتے ہیں اس کو ناقص سمجھتے رہتے ہیں اور مزید کی خواہش وطلب میں لگے رہتے ہیں۔

فرمایا: "عمل کی دو قسمیں ہیں۔ عمل مطابق سنت اور عمل بالاخلاص۔

اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی پیش نظر ہو، مخلوق نظر سے معدوم ہو جائے۔

فرمایا: "شیخ کامل خود اپنے میں کرامت دیکھتا۔" "وفی انفسکم افلا تبصرون"

اس سے بڑھ کر کیا کرامت ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے گناہوں میں لذت محسوس کرتا تھا اب طاعت میں اس کو لذت و حلاوت محسوس ہوتی ہے۔"

یہ بجائے خود کتنی بڑی کرامت ہے۔

فرمایا: "مومن اور کافر کے عمل میں بڑا فرق ہے۔ الآیۃ۔ "ذرھم یاکلوا و یتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون ... . کلوا وتمتعوا قلیلا انکم مجرمون"

آج کیا حال ہے کہ آیتیں پڑھی جاتی ہیں مگر ہم پر اثر نہیں ہوتا ہے وجہ یہ ہے ہم اپنی اصلاح کے لئے سنتے ہی نہیں، اپنی غلطیوں کو نہ ٹٹولتے ہیں نہ ان پر نادم ہوتے ہیں۔"

اس کے برخلاف اللہ والے سے ذرا غلطی سرزد ہوئی فوراً کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے اور بے چینی و بے قراری کے ساتھ توبہ کرتے ہیں مضطرب اور پریشان ہو کر اور اپنے قصور کا اعتراف کر کے حضوری کی دولت سے نوازے جاتے ہیں ؎

کبھی طاعتوں کا سرور ہے کبھی اعتراف قصور ہے
ہے ملک کو جس کی نہیں خبر وہ حضور میرا قصور ہے

اس اعتراف قصور سے فرشتے بھی نا آشنا ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر میرے بندے گناہ نہ کرتے تو میں ایسی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتے پھر توبہ کرتے۔ "ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین"۔

بایزید بسطامی فرماتے ہیں:-

"ہم نے توبہ کی گھاٹی کو بہت سخت پایا۔" توبہ کا یہ مرتبہ تھوڑی ہے کہ صرف زبانی توبہ کی اصل حقیقت ندامت اور اپنے خدا سے شرم اور انفعال کی وہ کیفیت ہے جس میں بندہ اپنے رب سے گڑگڑا کر گریہ و زاری کر کے اپنے گناہ معاف کروا لیتا ہے۔

عدم استقامت، غیر مستقل مزاجی اور کیفیات کا اختلاف سالک کے لئے منزل کو بہت دور اور دشوار کر دیتا ہے، اور بسا اوقات عمر گذر جاتی ہے، اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اس حقیقت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا،

"نل کے نیچے برتن رکھو اور جب تھوڑا پانی آئے اس کو الٹ دو تو کیا وہ بھر سکتا ہے اسی طرح ہم تھوڑی دیر دینی مجلس میں پُرکیف روحانی وقت گذاریں پھر جو کچھ پایا تھا سب الٹ کر چلے آئیں تو کیا پھر ہمارا ظرف کبھی صلاح و تقوی سے پُر ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر برتن نل کے نیچے رہے پانی آتے آتے بھر جائے تو پھر بے اختیاری سے بہتا بھی ہے اسی طرح جب قلب پُرفیض پر واردات آتے ہیں تو اس وقت اہل دل اور اہل اللہ کی زبانوں سے فیض جاری ہوتا ہے اور اللہ کے بندوں کو نفع ہوتا ہے۔"

بلاوجہ بولنے، لغو بات کرنے اور ہر جگہ دخل دینے سے بچانے کے لئے صوفیہ نے ضابطہ مقرر کیا ہے، جس کے بارے میں حضرت نے فرمایا،

"مقتدی اور متوسط کو خاموش رہنا چاہئے یہاں تک کہ تم کو بلوایا جائے کیونکہ اگر بالارادہ بولو گے تو اس میں تکلف و تصنع ہو گا اور جو بات بھی تکلف و تصنع کے ساتھ ہو گی بے اثر ہو گی۔ باتوں میں تاثیر جذبات انفعالی اور کیفیات کی بنا پر آتی ہے جو دل ان سے خالی ہوتا ہے اس کی زبان بے اثر ہوتی ہے۔"

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی فرماتے ہیں:-

"یا اللہ میں تو گونگا تھا (کیونکہ انہوں نے ایک طویل زمانہ خلوت اور انقطاع عن الخلق کا گذارا تھا اسی زمانہ کو اپنے گونگ ہونے کے زمانہ سے تعبیر کیا) آپ نے مجھے بلوایا، اگر میرے بولنے سے نفع نہ ہوتا ہو تو مجھے پھر گونگا کر دیجئے۔"

یہ ہے اللہ والوں کا حال۔ وہ باتیں اس لئے نہیں کرتے کہ باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ اللہ کی مخلوق اللہ کی باتوں کی محتاج ہے۔

فرمایا:- "کبر و بڑائی کو پاؤں سے روند دینا چاہئے، ہاں اما بنعمۃ ربک فحدث اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان تحدیث نعمت کے طور پر کرو، اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا ذکر بطور تحدیث نعمت کرنا مستحسن ہے، لیکن مقصد تحدیث نعمت اور شکر خداوندی ہو تب ہی۔

فرمایا:- "حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں، "علم، عمل، اخلاص۔ تین چیزیں ہیں یہی خلاصہ ہیں سارے احسان و تصوف کا اور اخلاص سب پر حاوی ہے۔ اسی سے علم و عمل پر احسان کا رنگ چڑھتا اور اسی سے ان میں نور پیدا ہوتا ہے۔

"ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔ اولٰئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔"

اہل اللہ کے نزدیک وہ شخص نابالغ ہے جس کے دل سے ھوٰی اور خواہش نہ نکل جائے

"تزکیہ ہے دل کا شرط اولیں"

وہ ابھی حقائق سے ناواقف ہے، کہ فہم اور نور فراست سے محروم ہے جس نے اپنے نفس پر قابو پانا نہ سیکھا اور خواہشات نفسانی کا اتباع کرتا رہا، فرمایا کہ

"بندہ اچھی سے اچھی چیزیں کھائے پھر زہر کھائے ایسا ہے کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ ملائے، پھر توبہ نہ کرے بلکہ تکبر کرے۔"

گناہ بشری تقاضہ اور بشریت کے ساتھ لازم ہے لیکن مومن گناہ کر کے اس پر قائم نہیں رہتا وہ گناہ کے داغ سے بے چین ہو جاتا ہے اور اس داغ کو مٹانے کے لئے اپنے تن کو داغدار اور اپنے پیرہن کو تار تار کر ڈالتا ہے اپنے رب کو مناتا ہے اپنی عاجزی بے کسی اور بے بسی کا مظاہرہ کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل مطمئن ہو جائے، کہ اس کا رب اس سے راضی ہو گیا خواجہ صاحب کا شعر ہے ؎

مجذوب نارسیدہ کو واصل بنا دیا
ناقص کو ایک نگاہ میں کامل بنا دیا

"اللہ تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ طلب صادق ہے یا کاذب اگر طلب صادق ہے تو کبھی ایک نگاہ میں زخم خوردہ محروم حقیقت دل حقیقت آشنا اور نور عرفان آگاہ بن جاتا ہے کبھی بے کیفی طاری ہو جاتی ہے اور ذوق نہیں رہتا اور قبض کی حالت طاری ہو جاتی ہے، فرمایا اس وقت دنیا آنکھوں میں اندھیری ہو جاتی ہے۔ اور بے کلی اور تڑپ مرغ بسمل بنا دیتی ہے ؎

نہ وہ ذوق ہے نہ وہ شوق ہے
نہ وہ کیف ہے نہ سرور ہے
ہے ہر ایک چیز ہی بے مزہ
جو نظر سے اپنی تو دور ہے

لیکن یہی ہجر و فراق کا موسم کو وہ لذت بھی بخشتا ہے جس پر ہزار حضوریاں قربان ہوں۔ عاشق صادق کو اپنے محبوب حقیقی کے نام رٹنے میں جو مزہ ملتا ہے اور اس کی یاد میں جو کیف و سرور میسر ہوتا ہے وہ بسا اوقات لقاء اور حضور میں نہیں ہوتا ؎

ترا ذکر ہے تری یاد ہے ترا نام ہے ترا پیام ہے
ہے اگر نصیب تری رضا تو یہ ہجر جان حضور ہے

محبوب کے نام کی یہ رٹ اور آٹھوں پہروں کا ذکر محب حقیقی کی روح کو زندگی اور نشاط بخشتا ہے، اس کو بھی لن ترانی کا پیام ملتا ہے تو وہ اس کو حرماں نصیبی سمجھ کر در سے لوٹ نہیں آتا، بلکہ وہ رٹ لگاتا رہتا ہے اور جذب کے عالم میں دیوانگی کی ایسی صدائیں بلند کرتا ہے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں اور ہفت افلاک کے کلیجے پھٹ پھٹ جاتے ہیں ؎

تیری یاد دل کی ہے غذا تیرا نام روح کی ہے شفا
ترا جلوہ ساری حیات ہے ترا ذکر حاصل طور ہے

قرآن کریم میں انھیں رٹ لگانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما"

"یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا"

"اتباع سنت اور ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر نظر اور ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت جوش اتباع کا نتیجہ ہے یہ احسان کی روح ہے" فرمایا۔

"مسجد میں داہنے پاؤں سے داخل ہونا سنت ہے۔

بعض اکابرین فرماتے ہیں کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت داہنا پاؤں سنت سمجھتے ہوئے پہلے رکھنا ہزار مرتبہ ہوا میں اڑنے سے افضل ہے۔ ہوا پر اڑ کر اگر کرامت کا مظاہرہ کیا تو اس سے کیا حاصل، کیا ملا؟ روح کو کیا ترقی ہوئی؟ عمل کتنا درست ہوا؟ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نگاہ ہٹ جائے تو ہلاکت ہے۔ پھر کھلے شرک اور کبائر میں مبتلا ہونے کا اور خطرہ ہے"

"اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ"

فرمایا: "ہمارا شیخ بھی صرف خدا تک پہونچانے والا ہوتا ہے"

وہ اس راہ کی سالہا سال رہ نوردی کر کے ایک مرد کامل اور تجربہ کار مربی ہو جاتا ہے۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ جن گھاٹیوں سے وہ گذرا ہے اس کا پتہ اپنے شاگردوں کو بھی دیدے تاکہ ان پر راہ آسان ہو جائے۔

ممکن ہے کہ یہ مرد قلندر کسی مکتب کا پروردہ اور کسی مدرسہ کا سند یافتہ نہ ہو۔ اور انبیاء کرام کب مکتب و سند اور دستار کے محتاج تھے!

"وعلمناہ من لدنا علما"

اللہ تعالیٰ قلب میں علم ڈال دیتے ہیں اور ایک نور عطا فرما دیتے ہیں جو حق و باطل، صحیح و غلط میں امتیاز پیدا کرتا ہے وہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہیہ کے بارے میں اتنے ذکی الحس اور لطیف ذوق واقع ہوتے ہیں کہ عمل کی شکل دیکھ کر اس کی حقیقت پہچان سکتے ہیں اور اس کے صواب و ناصواب ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں وہ اگر مسائل قانونی شکل میں نہ جانتے ہوں اور مسائل کسی عالم سے ہی پوچھ لیتے ہوں، لیکن ان کا عمل "درسی علم" کے بغیر بھی آبگینہ کی طرح شفاف اور بے داغ ہوتا ہے۔

ان پر قرآنی آیات کے دقیق معانی، اشارات، نکات اور حقائق و لطائف منکشف ہو جاتے ہیں اور ہر مرتبہ تدبر و تفکر سے حقائق کے سرچشمے پھوٹتے ہیں ان کا علم ہر آن بڑھتا رہتا ہے۔ ترقی پذیر ہوتا ہے۔

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین"

فرمایا: "استقامت دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے ایک تو شیخ سے محبت ہو اور دوسرے اتباع سنت ہو۔

یعنی ایک طرف تو جس کو ٹھونک بجا کر اور مرد کامل پاکر اپنا شیخ بنایا ہے اس سے تعلق و محبت ہو کیونکہ محبت کچھ بھی نہیں دوسری طرف شریعت کا دامن نہ چھوٹے۔ بدعت کے پاس نہ پھٹکے۔ اس طرح ثبات اور استقامت حاصل ہو سکتی ہے اور گمراہی سے حفاظت ہو سکتی ہے"

علم نبوت کو شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور نور نبوت کو احسان سے۔ دونوں میں سے کوئی دوسرے سے جدا ہو جائے تو کمال پیدا نہیں ہو سکتا اور حق کا کامل اتباع نہیں ہو سکتا۔"

فرمایا: "پنجاب کے ایک صاحب آئے اور اپنا تعارف مولانا .... کے ذریعہ کرایا حضرت نے ڈانٹا اور غصہ میں فرمایا "کیوں آئے ہو؟"

کہا، "حضرت اسی کو مٹانے آیا ہوں"

"ایک صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے حضرت تھانوی سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو ملنا۔ کسی صاحب نے فرمایا کہ ارے داڑھی رکھ کر جاؤ حضرت سے تعلق رکھتے ہو حضرت کو بہت ناگواری ہوگی انہوں نے کہا کہ میں تو بیمار ہوں داڑھی رکھ کر جاؤں گا تو یہ داڑھی رکھنا حضرت کے لئے ہوگا اللہ کے لئے نہ ہوگا۔

پھر حضرت کے پاس گئے اور عرض کیا میرا دل مریض ہے میرا علاج کریں تو در حقیقت بات یہ ہے کہ اگر ظاہر ٹھیک نہ ہو دل ٹھیک ہو تو جلدی صلاح کی امید ہے لیکن اگر دل ٹھیک نہ ہو تو ظاہر ٹھیک کرنے سے کچھ نہیں بنتا لیکن دل کی اصلاح کے ساتھ، خواہ دیر ہی سہی ظاہر کی بھی اصلاح ضروری ہے"

فرمایا: "ایک بزرگ بیٹھے تھے ان کے ارد گرد حاضرین مجلس اور متوسلین بیٹھے تھے دیکھا کچھ لوگ لکڑی لا رہے اور جلا رہے ہیں تو ان بزرگ نے مریدین و حاضرین سے پوچھا، کہ اگر یہ لکڑیاں گیلی ہوتیں تو جلتیں؟ انہوں نے عرض کیا۔ نہیں!

پھر فرمایا کہ یہ آگ کے شعلے اسی کے اندر تھے یا نہیں؟ عرض کیا جی ہاں فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان میں عجیب صلاحیتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ اگر کوئی آگ لگانے والا مل جائے۔ تو یہ صلاحیتیں بھڑک اٹھتی ہیں اور چمکنے لگتی ہیں"

دوستو کچھ آسان نہیں ہے۔ دل مشکل سے بنتا ہے۔

لیکن یہ مشکل آسانی سے حل ہو جاتی ہے۔ شرط، ارادہ اور پختہ، غیر متزلزل اور غیر مذبذب عزم ہے، پھر اس راہ کے طے کرنے کے لئے صرف دو ہی قدم ہیں سے

کام لے ہمت سے چل اب کوئے جاناں کی طرف
تو نہ گھبرا فاصلہ کچھ بھی نہیں دو گام ہیں

ایک قدم لا الٰہ کا، مکمل نفی کا، ہر چیز سے نظر ہٹا لینے کا، ہر طرف سے دل کو کاٹ لینے کا،

دوسرا قدم الا اللہ کا صرف خدا کی ہستی سے لو لگا لینے کا، اپنے معبود کی یاد کا، اور اپنے حقیقی حاکم کے احکام و مرضیات کے لئے اپنی خواہشات کو تج دینے کا سے

نظر اُنکی نظر اپنی، پسند اُنکی پسند اپنی
نظر اپنی پسند اپنی نہیں ہوتی محبت میں

دو قدم ہیں، ایک نفی کا، ایک اثبات کا، ہر طرف سے کٹ کر خدا کے ہو جاؤ، دنیا میں رہ کر اور اس کو برت کر دل کو یکسو رکھو۔

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

بقیہ صـــ:

پتہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے، قاہرہ کے جو تاریخی مقامات اہرام مصر وغیرہ کہاں ہیں اس کو پتہ ہی نہیں تھا، اس کو آپ بد مذاقی یا مردہ دلی پر محمول کیجئے لیکن یہ واقعہ ہے اور جو بھی لازوال اور لافانی تصانیف ہیں ان کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا ایک عالم طاری ہو گیا ہے یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب و مشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ جاوید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلوائیں جن سے اختلاف کے باوجود ان کی علمی قدر و قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں:

میرا روئے سخن خالص اپنے دوستوں سے ہے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں مشترک دانشگاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو چڑھانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی تھا، "اچھا آپ اس نسل اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوا دیا تھا" ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے وہ زمانہ پایا ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منھ چھپاتے تھے بلکہ منھ چراتے تھے اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں۔ ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے اور اس میں فلاسفہ کی اور منطقیوں کی کتابیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہیں تو اسکی ضرورت نہیں اگر خلاف ہیں تو اس کو آگ لگا دینی چاہیے چنانچہ شاید لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگا دی۔ یہ ایک کہانی تھی جس کو ٹائن بی (Toynbee) جیسا مؤرخ تک دہراتا ہے۔ ٹائن بی (Toynbee) نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال اتاترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی ضرورت نہیں صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ نے اس پر قلم اٹھایا اور اس مسئلہ ہی کو آخری طور پر ختم کر دیا اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ کتب خانۂ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ان کے حکم سے جلایا گیا۔ انہوں نے مغربی فضلاء کی شہادتوں سے ثابت کر دکھایا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا۔ یا مثلاً انہوں نے حقوق الذمیین پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کر دیا یا انہوں نے شعر العجم پر قلم اٹھایا خواہ وہ شعر العجم کے بہت سے نظریات میں تبدیلی ہو چکی ہو لیکن براؤن (Brown) نے کہا کہ اگر مجھے اردو سیکھنے کی تمنا کبھی ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست شعر العجم کو سمجھ سکوں، یہ سب اس علمی شغف اور اس علمی استغراق کا نتیجہ تھا جو ان لوگوں پر طاری تھا مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب "خیام" جو دراصل ان کا موضوع نہیں تھا ان کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام تھا۔ لیکن انہوں نے خیام پر ایک ایسی کتاب لکھی جو ایران میں بھی قابل استفادہ ہے۔ اسی طرح اگر آپ جائزہ لیں تو نزہۃ الخواطر کے مصنف نے جو ۲۵ سال تک محنت کی اور اس میں منہمک رہے، مجھے یہ کہنے میں کوئی شرم اور تواضع مانع نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ میرے والد ماجد تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب نے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر

(بقیہ صـ ۱۳ پر)

علامہ سید سلیمان ندوی رح

علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد

تحریر: محمد یعقوب

مختار مسعود اپنی تصنیف "آواز دوست" میں رقمطراز ہیں:-

"قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں۔"

یہ ہمارے دور پر صادق آتا ہے جس دور میں سید سلیمان ندوی پیدا ہوئے — (۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء) اس دور میں (۱۸۵۷ء-۱۸۸۶ء کے درمیان) پانچ سلیمان پیدا ہوئے اور ان پانچوں کی عزت و عظمت کے لئے چن لیا گیا۔ عمر کے تفاوت کے باوجود ایک ہی وقت میں سب کی شہرت عام ہو گئی۔ کوئی پختگی کی عمر کو پہنچ کر نمایاں ہوا تو کوئی نوعمری ہی میں چمک اٹھا۔ غرض آسمان شہرت پر آئے تو کہکشاں بن کر۔ مشہور عالم و واعظ اور صوفی شاہ سلیمان پھلواری کو اولیت اور سید سلیمان کو خاتمیت کا شرف ملا۔ درمیان میں قاضی سلیمان سلمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین)، مولانا سلیمان اشرف بہاری (سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ علیگڑھ) اور سر شاہ سلیمان (شیخ الجامعہ علی گڑھ)

اس اجتماع کی وجہ سے تخصیص اسمی کی غایت یعنی امتیاز و تعارف فوت ہو گئی تھی۔ ایک کا اسم گرامی سن کر دوسرے کی شخصیت کا ذہن میں آجانا بعید نہ تھا۔ آپ نے شروع شروع میں نام کے ساتھ دیسنوی لکھنا شروع کیا جو آپ کی جائے پیدائش کے نام پر تھا۔ جلد ہی یہ خاکی نسبت علمی نسبت سے بدل گئی۔ آپ دیسنوی کے بجائے ندوی لکھنے لگے۔

سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے بھائی مولانا ابو حبیب سے پائی پھر اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پورہ تشریف لے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ بھیج دئے گئے۔ یہاں ایک سال رہ کر مولانا محی الدین سے کچھ کتب پڑھیں پھلواری کے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دئے گئے۔ یہاں بھی ایک سال رہ کر آپنے درس نظامیہ کی بعض کتب ختم کیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت پر آپ کے والد ماجد کی کافی توجہ تھی۔ نشست و برخاست گفتار، رفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ بچوں سے کوئی نامناسب بات سرزد نہ ہو۔ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے ایک سالہ قیام کے بعد ۱۹۰۱ء میں آپ ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کرا دئے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں وہاں سے سند فراغ حاصل کی۔

ندوہ پہنچ کر آپ کو علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے بے مثل ادیب و مؤرخ، فلسفی و متکلم محقق و مفکر کی آغوش تربیت میسر آئی۔ کلام تاریخ اردو ادب تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کا اعلیٰ مذاق حضرت العلامہ شبلی نعمانی سے، اس کے علاوہ شاہ سلیمان پھلواریؒ مہتمم مدرسہ کی حوصلہ افزائیاں بھی آپ کے علمی ترقی میں ممد و معاون رہیں۔

دار العلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گزر چکے تھے مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ، جس کا رواج ہندوستان کے عام مدارس میں تھا، نہیں ہوا تھا۔ اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۶ء (۳ محرم ۱۳۲۴ھ) میں رفاہ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام جلسہ ہوا جسکی صدارت مولانا غلام محمد، فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم و جدید علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی کافی تعداد شریک تھی جو دار العلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔

مولانا شبلی نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کی تیاری کی ہدایت فرمائی۔ اس ضمن میں مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اور سید سلیمان ندوی نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی۔ اسی تقریر کے دوران میں کسی نے اٹھ کر کہا،

"اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو بے شبہ ہم ندوہ کی تعلیمی کرامات کا یقین کریں"

مولانا شبلی جلسہ سے باہر چلے گئے۔ مولانا سید عبدالحی صاحب نے آپ سے پوچھا، "تم کر سکتے ہو" آپ نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کر دی۔ جلسہ پر ایک سماں چھا گیا مولانا شبلی کو باہر خبر ہوئی تو فوراً اندر واپس تشریف لائے اور آپ کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ آپ نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ تو مولانا نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اس طالب علم نے جو تقریر کی۔ اسکی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے۔ رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں یہ اس پر تقریر کریں گے"

لوگوں نے موضوع کے تقریر کے لئے خواجہ غلام الثقلین مرحوم (جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے) کا نام پیش کیا انہوں نے "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" کا موضوع مقرر کیا۔ آپنے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ ہر طرف سے احسنت و آفرین کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں۔ استاد محترم شبلی نعمانیؒ نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر آپ کے سر پر باندھ دیا جو آپ کے لئے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا۔

اس کے بعد آپ کی ہر تقریر و تحریر تحقیقی استاذ عالی مقام کے دل میں شاگرد کی عظمت بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آپ کی ذات علامہ شبلیؒ کی نظر انتخاب کا حصہ بن گئی۔ ۱۹۱۳ء کے اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے آپ کی علمی جامعیت کے بارے میں کہا:-

"ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا! صرف ایک سلیمان پیدا کیا تو یہی کافی ہے"

فارغ التحصیل ہونے کے بعد "الندوہ" جیسے بلند پایہ خالص علمی ماہنامے کی ادارت میں بطور نائب مدیر شریک ہوئے۔ یہ دراصل شعبہ تصنیف و تالیف سے متعلق تھا۔ اس لئے عام آدمیوں کی ہمت اس میں مقالہ نگاری کی نہیں ہوتی تھی۔

۱۹۰۸ء میں آپ کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں علم کلام اور جدید عربی کے استاد کی حیثیت سے علامہ شبلی نے منتخب کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۴-۲۵ برس کی تھی۔

۱۹۱۲ء میں ملکی سیاست میں اتحاد اسلامی کا جوش اٹھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے جو اس وقت کلکتہ سے ہفت روزہ "الہلال" نکالتے تھے۔ سید صاحب کو اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آپ کو علامہ شبلی کے ایماء پر کلکتہ جانا پڑا۔ عربی کے قدیم و جدید ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی و تمدنی سیاسی و تاریخی ہر عنوان سے بہترین مقالہ آپ کی ذمہ داری تھا۔ مگر سیاست حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں بھی آپ مولانا ابو الکلام سے پیچھے نہ رہے۔ چونکہ "الہلال" پر مولانا ابو الکلام آزاد کا نام ہوتا تھا اس لئے بہت سے لوگوں کو پتہ نہ چل سکا۔ ایک سال کی رفاقت کے بعد جب بوجوہ سید صاحب نے اس تعلق کو ختم کیا تو "الہلال" بھی وہ نہ رہ سکا۔ مولانا آزاد گھبرائے اور آپ کو ایک طویل خط لکھا الہلال کے بعد پھر آپ حضرت

سید صاحب نے مغربی ریسرچ سکالروں پر ثابت کر دیا کہ مشرقی علماء کسی طرح ان سے پیچھے نہیں

اپنی پاکیزہ مشربی کی وجہ سے عملی سیاست سے

کنارہ کش رہے

شبلی کے پاس تشریف لے آئے لیکن یہاں سے بھی قدرت نے جلد ہی بمبئی یونیورسٹی کے نامی گرامی دکن کالج پونہ میں پہونچا دیا۔ وہاں آپ نے ایک یہودی عالم سے عبرانی زبان سیکھی اور اس نیت سے یہ مشقت اٹھائی گئی کہ عربی الفاظ کے عبرانی ماخذ پر عبور حاصل ہو جائے۔ اسی اثناء میں آپ نے اپنی مجتہدانہ تصنیف "ارض القرآن" کا آغاز کیا جو قرآنی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور جس کی وجہ سے متداول تفاسیر کی کتنی تاریخی وجغرافیائی غلطیوں کا ازالہ ہوا۔ علماء نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے حواشی

قرارداد مقاصد کی تیاری آپ کی مرکزی شخصیت کی مرہونِ منت تھی

قرآن میں موقع بموقع اس سے استفادہ کیا ہے۔

اسی زمانے میں آپ نے عمر خیام پر کتاب لکھی جس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے آپ کو لکھا:۔

"عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔"

سید صاحبؒ نے خود اس تصنیف کے بارے میں فرمایا:۔

"میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہار کے لئے پیش کی تھی کہ اہل مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے۔ مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں خدا کا شکر ہے ایسا ہی ہوا۔"

علامہ شبلیؒ کی وفات (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد وابستگان شبلی نے مل سید صاحب کے سر پر استاد مرحوم کی جانشینی کا تاج رکھا اور سید الطائفہ کا لقب دے کر آپ کی جلالت شان کا اعتراف کیا۔

جب مولانا شبلیؒ کی وفات کا وقت قریب محسوس ہوا تو انہیں سب سے زیادہ رنج سیرت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام مسودات اور دیگر کاغذات کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرا دئے اور اعزا کو جو تیمارداری میں مصروف تھے وصیت فرمائی:۔

"یہ مسودے حمید الدین (مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی) اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں ان دونوں کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دئے جائیں۔"

وفات سے قبل آپ کو اطلاع ملی کر فوراً چلے آئیں آپ مضطرب اعظم گڈھ پہنچ گئے۔ حیات شبلی میں سید صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو میں پہونچا تو طاقت جواب دے چکی تھی میں سرہانے کھڑا تھا میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے مولانا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا "اب کیا! اب کیا!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آ گئی تو ایک جادہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ضرور! ضرور!"

اللہ کے فضل وکرم سے سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس عہد کو پورا فرمایا۔ آپ کے کام کا اندازہ صرف سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمام جلدیں اول تا آخر پڑھیں تسلسل کے اعتبار سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے کام سید سلیمان ندوی کے کہاں سپرد کیا (اللہ دونوں بزرگوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آقا و مولا شافع محشر سرور کشور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب عطا فرمائے)۔

زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے

زیادہ قحط الرّجال کا غم کھاتے ہیں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مطبوعہ مکاتیب میں ستر سے زیادہ وہ خطوط ہیں جو انہوں نے سید العلماء سید سلیمان ندوی کو لکھے ان میں اقبالؒ نے مسئلہ زمان ومکان ختم نبوت حقیقت وحی۔ قرآن میں ناسخ ومنسوخ اور اسلام میں خلیفہ کے اختیارات جیسے چوٹی کے فلسفیانہ اور متکلمانہ قرآنی اور فقہی مسائل میں استفادہ فرمایا ہے اور بار بار اعتراف کے ساتھ۔

"مولانا شبلیؒ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں"

"علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔"

آپ کو عملی طور پر سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ایک مورخ اور مفکر اسلام کی حیثیت میں آپ کا ایک ایک جملہ اصابت رائے، دور بینی وسائل اندیشی کا معیار ہوتا تھا، کیا اپنے کیا پرائے سب آپ کی فراست کے معترف تھے۔ اسی لئے مسلمانان اہل سیاست نے بار بار عملی سیاست میں آپ کو اپنی طرف کھینچا کبھی مولانا محمد علی جوہرؒ کبھی مولانا شوکت علیؒ نے لیکن آپ نے فوراً ہی علیحدگی اختیار کر لی۔

وجہ گریز خود سید صاحب فرماتے تھے:

"ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانت دار مانا جائے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو دیانت دار اور اچھا مانا جائے اور پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔"

اس پاکیزگی مشرب کی وجہ سے آپ عملی سیاست سے کنارہ کش تھے۔ زیادہ سے زیادہ مشورے اور رائے کی حد تک تعاون کرتے تھے۔ خود فرماتے تھے:۔

"بھئی مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے۔ پبلک پریکٹس نہیں آتی۔"

اس کے باوجود خدا نے آپ کو اجتماعی امور میں بھی وہ سربلندی عطا فرمائی تھی جو آپ کے معاصر علماء میں سے کسی کو نہ مل سکی۔

جون ۱۹۴۶ء کو ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ بھوپال کے صدر کے دوگانہ عہدوں پر فائز ہوئے۔ آپ کے مرتبے کا احترام نواب بھوپال اس قدر فرماتے تھے کہ ایک بار سید صاحب نے کسی بات کی منظوری کی سفارش فرمائی تھی جس کا منظور کرنا نواب صاحب کے اختیار میں تھا۔ نواب صاحب نے بجائے ایک لفظ "منظور" کے یہ جملہ لکھ کر دستخط کئے۔

"حسب سفارش حضرت قاضی صاحب منظور"

قیام بھوپال کے دوران میں حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے کاموں کی سرپرستی فرماتے رہے جس کا بھوپال میں اچھا بڑا مرکز تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ریاست بھوپال ہندوستان میں ضم ہو گئی تو وہاں کا نظام کار بدلا افراد کار نئے آ گئے۔ افراد کی یہ تبدیلی فکر ونظر اور اقدار حیات کی تبدیلی تھی آپ جیسی غیور ہستی کے لئے ان حالات میں تعاون ناممکن ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں آپ نے استعفاء دے دیا اور عازم حج ہو گئے۔

قیام پاکستان سے قبل ہی مسلم لیگی علماء کی نظر علامہ سید سلیمان ندوی پر تھی۔ پاکستان بننے کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو اُن کی مساعی سے مارچ ۱۹۴۹ء میں "قرارداد مقاصد" پاس ہوئی جو ہمارے موجودہ دستور میں بھی شامل ہے جس کی رو سے دستور پاکستان کو قرآن وسنت کے مطابق اور حکومت کے کاموں کو بتدریج اس کے مطابق ڈھالنا ضروری طے پایا تھا اس کے لئے ان ماہرین قانون کی ضرورت تھی جو جدید دستور قانون سے بھی واقف ہوں اور کتاب وسنت کے بھی پختہ عالم۔ اس کے تحت یہ طے پایا تھا کہ پانچ علماء پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے جو اسمبلی کے پاس شدہ دستوری سفارشات کو اصول شرع پر پرکھ کر ان کو کتاب وسنت کے مطابق کر سکے اس بورڈ کی رہنمائی کے لئے وزیر اعظم خاں لیاقت علی خان کی نظر علامہ سید سلیمان ندوی پر تھی اس کے لئے حکومت پاکستان کی طرف سے آپ کے نام دعوت نامہ جاری ہوا۔ آپ عجیب کشمکش سے دوچار ہو گئے کیونکہ ہندوستان کے پریشان حال ونادار مسلمانوں کی ڈھارس جن دو چار ہستیوں سے بندھی تھی آپ ان میں سب سے اہم تھے۔

تنہا دستور سے مملکت اسلامی نہیں بن سکتی جب تک اس پر قانون سازی نہ ہو

۲۱۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب آپ حج سے فارغ ہو کر واپس بھوپال پہنچے تو مولانا احتشام الحق تھانوی کو لیاقت علی خاں نے آپ کو لانے کے لئے بھیجا۔ مولانا نے پاکستان کے تمام احوال سنائے

نوزائیدہ اسلامی مملکت میں آپ کی ضرورت واضح کی۔ آپ نے وعدہ تو نہیں فرمایا البتہ عارضی طور پر آنے کا یقین دلایا۔

۱۴۔ جون ۱۹۵۰ء کو آپ چند روزہ قیام کی غرض سے کراچی پہنچے۔ اس وقت وزیر اعظم پاکستان امریکہ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ پہلے ان سے براہ راست بات ہو جائے تو پھر تعلیمات اسلامی کے بورڈ میں شرکت یا عدم شرکت کا فیصلہ ہو۔ اگر فیصلہ ہو جائے تو ہندوستان واپس جا کر اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کا عزم کیا جائے وزیر اعظم واپس آئے اس کے باوجود ایک ماہ تک نوکر شاہی مصلحتوں نے آپ سے ملاقات کرانے میں پس وپیش کی۔ آپ پر اس دوران میں بہت سی باتیں عیاں ہو گئی تھیں۔

انہی ایام میں انجمن ترقی اردو کے جلسہ میں آپ نے ایک محققانہ مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمران" پڑھا۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم صدارت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس جلسہ میں اعلان فرمایا کہ اب حضرت علامہ پاکستانی بن چکے ہیں، واپس ہندوستان نہیں جائیں گے آپ اسی بنا پر فرماتے تھے

"میری ہجرت اختیاری بھی ہے اور اضطراری بھی"

جمعیۃ العلماء اسلام کی جانب سے شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی رحلت کے بعد جمعیت کی صدارت پر نہ ہو سکی تھی یہ اعزاز آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے انکار فرمایا بعد میں مسلسل اصرار اور بعض قابل اعتماد حضرات کی یقین دہانی پر آپ نے اواخر ۱۹۵۲ء میں جمعیت کی صدارت منظور فرمائی اور تادم آخر صدر رہے۔

حکومت پاکستان نے دستور سازی کے سلسلہ میں بنیادی اصولوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۰ء میں شائع کی، جس میں بورڈ اسلامی تعلیمات کی سفارشات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ضروری تھا کہ ہر مکتب خیال کے علماء اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلامی دستور وآئین کا ایک متفقہ خاکہ حکومت اور عوام کے سامنے پیش کریں آپ کی رہبری اور صدارت میں ۳۱ علماء کا ایک اجتماع کراچی میں منعقد ہوا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ علماء نے شرکت کی اور تین دن کی کوشش میں ایک دستوری خاکہ تیار کر دیا۔ علماء کے اس متحدہ کارنامے پر اہل حکومت حیران تھے اور سب نے اعتراف کیا کہ یہ کارنامہ صرف علامہ سید سلیمان ندوی کی مرکزی شخصیت کا رہین منت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سید سلیمان ندوی کا دوسرا بڑا کارنامہ لا کمیشن کا قیام ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ تنہا دستور سے نہ تو مملکت اسلامی بن سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی انقلابی شان نمایاں ہو سکتی ہے۔ انقلاب تو جب برپا ہو گا کہ وہ قانون جس سے رعایا شب وروز دوچار ہوتی ہے اسلامی بنا جائے یہی نکتہ آپ نے لیاقت علی خاں کے گوش گزار کیا۔ وہ اس کی گہرائی کو پا گئے چنانچہ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں وزیر اعظم پاکستان نے لا کمیشن کا اعلان کیا جس کے تین اراکین جسٹس رشید، جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندوی قرار پائے۔ اس کمیشن کا وظیفہ یہ تھا کہ مروجہ قانون پر نظر ثانی کر کے اس کو حدود شرع کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس کے بعد آپ نے تعلیمات اسلامی کے بورڈ میں شرکت کی آپ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کے لا کمیشن میں لئے جانے کی تحریک فرمائی اور اس کو منوا لیا۔ یہ آپ کے احساس ذمہ داری احتیاط اور خشیت وتقویٰ کی ایک کھلی نشانی ہے۔

"علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔؟"

مولانا مفتی محمد شفیع نے کئی بار اظہار فرمایا کہ لا کمیشن میں حضرت علامہ صاحب کی شخصیت اسقدر دقیع اور وزنی تھی کہ ان کے چند جملے ججوں کو ساکت اور مطمئن کر جاتے تھے۔

حیات سلیمان کے یہ چند واقعات نامکمل سا خاکہ ہیں جو ان کی ہمہ گیر شخصیت کا کسی حد تک احاطہ کرتے ہیں۔ ذکر ادھورا رہ جاتا ہے۔ اگر ان آٹھ خطبات کا جو اکتوبر ونومبر ۱۹۲۵ء میں "مسلم ایجوکیشن سوسائٹی آف سدرن انڈیا" کی دعوت پر آپ نے شہر مدراس میں دیے اور بعد میں "خطبات مدراس" کے نام سے شائع اور مشہور ہوئے۔ یہ سید صاحب نے قلم برداشتہ تحریر کئے تھے۔ اتنی مختصر اور جامع تصنیف ہے کہ بار بار مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ الفاظ ایسے جڑے ہیں جیسے جوہری چن چن کر ہیروں کو ٹانکتا ہے۔ یہ خطبات مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے الفاظ میں سیرت نبوی ﷺ کا عطر ہیں جس سے بہتر طریقہ ابھی تک سیرت کو پیش نہیں کیا گیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے سید صاحبؒ کی موجودگی میں حیدرآباد دکن کے ایک جلسہ میں یوں اظہار خیال فرمایا:۔

"سیرت کی مجالس کہ حضرت سید سلیمان ندوی کے تقریر پر تبصرہ کہ جرأت کر دلے وہ جو علم کے خواص ہیں میرے بازار کے رونق انہیں کے نکالے ہوئے جواہر کے تھے۔ میرے خطبات مدراس کو رٹ رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا ہے۔"

یہ تربیت اور رہنمائی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی نظر میں وسعت اور طبیعت میں اعتدال تھا۔ یہی وسعت نظر اور قلب کی فراخی تھی کہ آپ نے ہندوستان کے ایک نامور ادارے کے سرخیل ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص تعلیمی واصلاحی خیالات رکھنے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع و استفادہ کیا۔ اور اس میں ان کو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔

آج قحط الرجال کے اس دور میں اصل مسئلہ شاید ہر فکری سرمائے کی حفاظت اور عملی طور پر اس سلسلے میں کام کی شدید ضرورت ہے۔ بزرگوں کے کاموں اور ان کی زندگی سے سبق اور رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے ہم نے بے اعتنائی برتنا شروع کر دی ہے جس سے فکری سوتے خشک ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ ان حالات میں کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں کے روشن کام کو زندہ رکھا جائے ہر قیمت پر اسکی حفاظت کی جائے۔ اسلام پر اردو میں جتنا کام ہوا ہے اس میں بیشتر حصہ اس ادارے کا ہے جس سے سید سلیمان ندویؒ کا تعلق تھا۔ پھر اس کام میں سید صاحب کا حصہ سب سے زیادہ ہی ملتا ہے بلکہ یہ تو فیضان جاریہ ہے۔!!

بقیہ صفحہ ۱۶

ہندوستانی علماء اور اعیان کے موضوع پر قلم اٹھایا اور حیرت کی بات ہے کہ ان کو ۱۹۱۵ء میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ یہ کتاب عربی میں لکھیں، ان کو اُردو میں لکھنی چاہیے تھی اگر اردو میں نہیں تو فارسی میں لکھنی چاہیے تھی لیکن انہوں نے اس کی ہمت کی جب کہ یہاں عربی پڑھانے کے وہ طریقے رائج نہیں تھے جس سے وہ اہلیت پیدا ہو سکے کہ اہل زبان کے لئے عربی میں ایک کتاب لکھی جائے۔ عربی زبان میں کتاب کی پیشکش تو ان کی علمی جرأت کا معاملہ ہے لیکن جہاں تک انکی اہلیت اور محنت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن تک (ان کی موت اچانک واقع ہوئی تھی) اس میں منہمک رہے، آپ کو شاید علم بھی ہو آٹھ جلدوں میں یہ کتاب چھپ چکی ہے جسے دائرۃ المعارف عثمانیہ نے چھاپا ہے۔ شکر ہے کہ ہندوستان نے اس کی قدر کی۔ خاص طور پر اس میں مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا بڑا احسان ہے اس کتاب میں ۴½ ہزار سے زائد ہندوستانی فضلاء بادشاہ اور وزراء اور باکمال لوگوں کے حالات ہیں اس وقت بھی یورپ میں اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے اسی طرح ان کی دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" ہے جس کو دمشق کی اکیڈمی نے بڑے فخر کے ساتھ شائع کیا میں نے وہاں کے فضلاء کی مجلسوں میں منھ بھر بھر کر اس کی تعریفیں کرتے سُنا۔ یہ سب اس کا نتیجہ ہے ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں دیتی۔ یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمونہ، ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ اور ایک آدمی کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے اور آج اکیڈمی بھی موجود ہیں بڑے بڑے ادارے اور بڑے بڑے شعبے بھی موجود ہیں لیکن دس دس برس گذر جاتے ہیں ۲۰۔۲۰ برس گذر جاتے ہیں وہ کوئی ایسی پیشکش نہیں کر پاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر یہ کہیں کہ ہاں یہ اوریجنل (original) چیز ہے۔ بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا وہ مصرعہ پڑھنا پڑھتا ہے۔ ع

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ محنت انعام بھی ہے، پیاس بھی ہے پانی بھی، بھوک بھی ہے غذا بھی، جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے میں نے اپنا کام کر دیا، میری محنت وصول ہو گئی۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو: دوسری چیز یہ ہے کہ یہ دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو، مثلاً سمینار کے لئے ہم اس موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کے لئے طاری کر لیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کی جاتی ہے پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں پھر اس کے بعد نہ ہمیں اس مقصد سے محبت ہو نہ وفاداری ہو اور نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا اور نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو کہ اس میں کچھ معلومات کا اور اضافہ کر دیا۔ میں اس موقع پر اقبال سے مدد لیتا ہوں انہوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے کہ سب ہنر ہیں سے

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

(بقیہ ص ۳۴ پر)

صادقِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

از: جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ
(ناگپور)

نبیٔ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے مافوق البشر شخصیت بنا کر نہیں بھیجا بلکہ وہ ایک عارفِ کامل، داعیٔ حق، معلمِ انسانیت، مزکیٔ اور باعظمت معظم اخلاق، مصلح اور محسنِ اعظم، اعلیٰ حوصلہ، شرفِ آدمیت، حیرت انگیز قادر الکلامی، قول و فعل میں امین اصحابِ ضمیر، علم و عمل کا انمول خزانہ و نمونۂ حیات بنا کر مالکِ کائنات رب العالمین کی طرف سے ہم انسانوں کی تربیت کے لئے نادر الوجود بنا کر بھیجا گیا ہے۔ تمام عمر کی کارکردگی میں اوّل تا آخر خدا کے نبی کو انسانوں ہی سے تعلق و نسبت ہوتی ہے، رشتہ ناطے والے، ماننے والے، انکار کرنے والے، مان کر بغاوت کرنیوالے، ساتھ چل کر دھوکہ دینے والے، لین دین، معاشرت و معیشت میں ہر طرح کے لوگوں سے نبی کو دن رات سابقہ پڑتا ہے، اور ان سے بھی جو ہر طرح کی کوشش مکر و چالبازی، دھوکہ، دھونس، دباؤ اور دھاندلی سے نبی کو اپنی دعوت اور مشن سے ہٹا دینے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس میں ناکامی ہو تو پھر نبی سے سودے بازی کر کے پھونک دے کر حق کا چراغ بے نور کرنے کی تجویز کا استعمال کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ چونکہ ایسے موقعہ پر مخالفین ہر طرح کے جائز ناجائز ہتھیار کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ تب اسی دور میں اللہ کے نبی کی سچائی، امانت، بے لوث خدمتِ خلق اور اپنے بھیجنے والے کے پیغام کے عین مطابق اپنی سیرت کی تعمیر کا کھلا مظاہرہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔

اگر نبی کوئی مافوق الفطرت ہستی یا غیر بنی آدم یا غیر انسان ہو تو اسکی تعمیر سیرت کے ترجیحی پہلو آشکارا ہونے کی قطعی ضرورت و امکان ہی نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو قرآن کا یہ بیان:۔

"وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذاً لاتخذوک خلیلاً ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً اذاً لاذقناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیراً۔"

(۱۷۔ بنی اسرائیل ۷۳، ۷۴، ۷۵)

(اور قریب تھا کہ یہ لوگ تم کو اس وحی سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے بچلا دیتے تاکہ تم ہماری طرف قرآن کے سوا کچھ اور بات کی نسبت لگا دو، تب تو یہ تم کو اپنا گہرا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے تمہیں ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو تم کچھ نہ کچھ ان کی طرف جھک جاتے اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہم تمہیں زندگی میں دگنی سزا چکھاتے اور دگنا مرنے کے بعد بھی۔ پھر تم ہمارے عذاب سے چھوٹ جانے میں کسی کو مددگار بھی نہ پاتے)۔

کسی خود پسند مصلح و بناوٹی داعی یا سیاسی لیڈر کی زندگی اور نبی کی زندگی کا فرق ملاحظہ کیجئے۔ نبی اپنے آپ کو خدا کا بھیجا ہوا بتاتا ہے اور اس پر نازل شدہ کلام کو جو خدا کا پیغام ہے انسانوں کے نام نشر کرتا ہے۔ اور اس کلام میں جب خود اس نبی کے بارے میں کوئی واقعہ، بات، نصیحت، تنبیہ یا نقد و جرح یا اس کے نازک احساسات اور لطیف جذبات اور مخالفین کے مقابل اس کی قوتِ مدافعت کی آہنی دیوار میں ذرا سا اور بہت ہلکا اور خفیف سا جھکاؤ بھی اس باعظمت نبی کے منصب کے خلاف بتا کر وحی کے ذریعہ اسے عارضی ماحول سے نکالنے کی کوشش اور اس حالت پر تبصرہ کرنے کے لئے رب کائنات کی طرف سے جو آیت نازل ہوتی ہے صادقِ اعظم نبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم اس تنبیہ کو بھی دنیا کے سامنے بے نقاب کرتا ہے اور یہ اس کی صداقت کی سب سے بیّن اور اعلیٰ دلیل ہے۔ قادر ذوالجلال کے نمائندے کو واقعی ایسا ہی صاف باطن ہونا چاہئے۔ اللھم صل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

دیانت میں بے نظیر:

سورہ بنی اسرائیل کی تین آیات جو ہم نے ابھی ابھی پیش کی ہے۔ انہیں آپ دوبارہ پڑھ جائیے۔ آپ میں سے ہر ایک اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ دنیا کے سیاسی و صنعتی و ملّی قائدین یا اعلیٰ کمانڈر سے یا کسی آخری سلطانِ وقت سے FINAL ATHORTY سے کبھی کسی ڈانٹ یا ناراضگی یا پالیسی میں کسی خاص بات پر اظہارِ تنبیہ کو اپنے سے نیچے والے اور ماتحت لوگوں کو ہرگز پتہ نہیں چلنے دیتے کہ کہیں ان پر ہماری پکڑ ڈھیلی نہ ہو جائے۔ اور ہماری ساکھ اور مرتبہ میں کمی نہ آ جائے۔ دیانت میں بے نظیر کسی جاندار مذہب کے داعی کا یہ مقام تو صادقِ اکبر نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ ربِ اعلیٰ کی طرف سے جب بھی ایسی کوئی تنبیہ آئی تو آپ نے اسے چھپایا نہیں بلکہ آج ۱۴۰۰ برس سے اس طرح کی بہت سی باتیں برابر تلاوت و نماز، تراویح و مصحف میں مسلسل پڑھی جاتی ہیں ایسی بہت سی آیات میں سے چند آپ بھی پڑھ لیں۔

"یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللہ غفور رحیم ۰"

(۶۶۔ التحریم۔ ۱)

(اے نبی! کیوں آپ نے ایسی چیز اپنے آپ پر حرام کر دی جو اللہ نے آپ کے لئے حلال رکھی تھی؟ کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟)

اس آیت کا شانِ نزول جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجۂ محترمہ کے یہاں شہد سے بنا ایک مشروب پینا بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ بتقاضۂ بشریت آپ کی دوسری ازواج مطہرات کو یہ بات ناگوار ہوئی تب حضور نے ان ازواج کو خوش کرنے کے لئے یہ مشروب ترک کر دیا اور اپنے آپ پر اس کی بندش لگا دی کہ اب وہ اس چیز کا استعمال نہ کریں گے۔ دنیا جانتی ہے کہ خانگی زندگی میں یہ بہت معمولی بات ہے لیکن قرآن میں اس کا نوٹس لیا گیا اور اپنی بعض ازواج کو خوش کرنے کے لئے کھانے پینے کی کسی حلال چیز کو چاہے محدود پیمانے پر اپنے آپ ہی پر بندش کیوں نہ لگائی جائے امت کے لئے حلال حرام کے اصول میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے قرآن کے نازل کرنے والے نے نہایت حکیمانہ طرزِ خطاب اور مؤثر پیرایۂ بیان میں حضور کا ایک گھریلو اور پرائیویٹ PRIVATE واقعہ بیان کر دیا۔ جو لوگ اپنے نبیوں اور مذہبی لوگوں کو خدائی خاندان کے نسب نامے میں جوڑنے کا فن دنیا میں چلاتے ہیں ان کے لئے جہاں یہ تازیانۂ عبرت ہے وہیں ان کی پروازِ تخیل باطن کی پتنگ بھی کاٹ کر رکھ دی گئی۔

بیوی بچے والے:

اللہ کے تمام نبی ذریتِ آدم تھے اور ان کے بیوی بچے بھی رہے۔ فرمایا "ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک وجعلنا لھم ازواجاً و ذریۃ وما کان لرسول ان یاتی بآیۃ الا باذن اللہ لکل اجل کتاب ۰"

(۱۳۔ الرعد۔ ۳۸)

(اور آپ سے قبل بھی ہم نے بہت سے رسول بھیجے تھے ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھی اور کسی رسول کے بس کی بات نہ تھی کہ خدا کی اجازت اور حکم کے بغیر کوئی نشانی یا معجزہ دکھا سکے ہر حکم کا وقت کتاب (قانون الٰہی) میں لکھا ہوا ہوتا ہے)

یہ آیت کریمہ ایک عینی فیصلہ ہے جو خدا اور نبی کے منصب کا تعین کرتی ہے اور ان تمام اہلِ باطل اور اہلِ غلو جاہلین کو تنبیہ کرتی ہے کہ بیوی بچے رکھنا، مرد ہونا، آدمی ہونا یہ سب باتیں لوازمِ بشریہ ہیں اور یہ بھی سن لو کہ نبی کو یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں کہ جب چاہے جتنا چاہے، جیسے چاہے کوئی نشانِ حق یا معجزہ دکھا دے۔ یہ سب اذنِ الٰہی کے بغیر کر ڈالنا نبی کے بس کی بات نہیں۔ جن لوگوں کو یہ عقیدہ پسند نہ ہو وہ چاہیں تو قرآن کی آہنی دیوار پر سر ٹپک کر مر جائیں مگر حق اٹل ہے اور قرآن کا فیصلہ ہی برحق ہے۔ کوئی مزید جاننا چاہے تو قرآن میں اسے انبیاء کے بیوی، بیٹے بیٹی کے سوا ماں، باپ، بھائی، بہنیں، خسر، خالہ، ماموں، چچا، نانا، نانی کا بھی ذکر مل جائے گا۔ ایک نبی جس علاقے میں مبعوث ہوتا ہے، وہاں اس کی رشتہ داریاں بعثت کے ساتھ ہی فطری طور پر ہر غیر نبی کی طرح وجود میں آ جاتی ہیں۔

چاندی کا مکر:

قرآن مجید نے عقائد کے تمام سیاہ پردے چاک کئے اور بشریتِ انبیاء کا ایسا کھلا، صاف، بے نظیر اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر بیان کیا کہ نور کے نام پر چاندی کا مکر پھیلانے والے باطل کے بہروپیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ غلو کی سیادت مندی کے دلدل

میں پھنسی سادہ دل عوام کو صاف صاف بتا دیا کہ نبی تمہارا ہے، تم ہی کا ہے۔

"لقد جاءکم رسول من انفسکم"

(تمہارے پاس جو رسول آیا وہ تم ہی کا ہے)۔

خود ساختہ تخیل کے بانیوں کو قرآن نے آخری ہچکی لینے پر مجبور کر دیا۔ اور علمِ حق کی دنیا میں اس نے شیطان کو ناک رگڑنے۔ عوام کو سہل الفہم طریقہ پر بتا دیا کہ اللہ کی نبی خدا کے اوتار یا اس کے رشتے دار، بھائی برادر اور اہلِ خاندان نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ اس کے بندے اور مخلوق ہوتے ہیں اور تمہارے ہی لئے، تمہاری ہی نوع اور تمہاری اپنی ہی نسلِ انسانی میں ان کی بعثت ہوتی ہے۔

کچھ لوگ مذہب کی دنیا میں ایسے بھی ہیں جو کسی نبی و مصلح کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ خدا ہوتا ہے۔ اور انسانوں کی اصلاح کے لئے آدمی کا جنم لے کر زمین کے باشندوں کے ظلم کو روکنے اور انہیں نیکی کا راستہ بتانے آتا ہے۔ علم و فن کی دنیا میں یہ غیر ظاہر تحفہ قدردانی کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھا جائے گا اگر اس کے درپردہ مدفون متعفن نتائج کو سامنے لایا جائے تو نیک آدمی کو جس طرح اپنی قے سے نفرت ہوتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر ایسے ناپاک عقائد سے ہونے لگے تو تعجب نہیں۔ انسانوں کی ہدایت اور انہیں صحیح طرزِ زندگی بتانے کے واقعی صرف دو ہی طریقے ہیں۔ ان میں ایک گمراہ انسانوں کا وہم و خیال کی دنیا کا طریقہ ہے اور ایک حق اور عین ممکن و نفع مند طریقہ۔ پہلا ناممکن طریقہ تو یہ ہے کہ خدا خود کسی آدمی کے نطفے سے کسی عورت کے رحم میں قیام پذیر ہو جب کہ یہ دونوں مرد و عورت اسی کی مخلوق اور اسی کے بنائے ہوئے ہو کر زمین میں رہتے بستے ہوں۔ پھر انسانوں کی ہدایت کے لئے آنے والا یہ خدا چند مہینے ماں کے پیٹ میں رہنے کے بعد رحمِ مادر کی گندگیوں اور آلائشوں اور ناپاکیوں سے ہوتا ہوا اپنی ہی کسی بندی کی شرمگاہ سے باہر آئے۔ (توبہ توبہ، نعوذ باللہ من ذالک)۔

پھر بچہ بن کر رہے۔ چند سال برہنہ رہے، پیشاب پاخانہ کرے، کھائے، پیئے، روئے، روٹھے، کھیلے، دوڑے بھاگے پھر جوان ہو کر شادی کرے، عورت سے صحبت کرے اسے بچے پیدا ہوں پھر وہ مر جائے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) یا سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون کے سوا اس باطل عقیدہ پر اور کیا کہا جائے۔

اتنے سارے پاپڑ بیل کر خدا ہماری ہدایت کو لے کر اس دنیا میں آئے کیا یہ طریقہ خدائے ذوالجلال، مالک و سلطانِ کائنات، ربِ عظیم، ملک القدوس کے شایانِ شان ہے؟ اور کیا اسے اس کی ضرورت ہے کہ وہ ایسا گندہ طریقہ اختیار کرے جب کہ ہم انسانوں میں سے کوئی فنا پذیر بادشاہ یا حاکم بھی کسی دور کے علاقے کے لوگوں تک اپنی بات یا حکم پہنچانے کے لئے بھی یہ طریقہ ہرگز ہرگز اختیار نہیں کرتا۔ پھر ہم اپنے اس مالکِ حقیقی جس کی تقدیس پر ہر بندے کا ایمان ہے اس کے بارے میں ایسا اوتاری عقیدہ کیوں رکھیں؟ اور کیا اس راہ سے ہر چالاک اور مکار آدمی یا کسی شعبدہ باز مداری تک اپنے لئے خدائی دعویٰ کا راستہ کھلا نہ پائیں گے۔؟

اب دوسرا طریقہ لیجئے کہ خدا نے جب انسانوں کی ہدایت کا ارادہ کیا تو انہیں انسانوں میں کسی ایک کو منتخب فرما کر اپنا پیغام اسے بھیجا، معجزات دیئے، آیات دی، کتاب دی، سلطان و سند عطا کی اور کبھی کبھی شرفِ ہم کلامی بھی پردہ کی اوٹ یا حجاب میں عطا فرمایا۔ کبھی چاہا تو اپنے آخری نبی کو معراج کی فضیلت سے سرفراز فرمایا، اپنی کائنات کی سیر کرائی۔ اب آپ میں سے ہر عاقل و بالغ شخص خود فیصلہ کرے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے یہ دونوں طریقوں میں پہلے طریقے پر عقیدہ رکھنا زیادہ پاکیزہ ہے یا دوسرے طریقے پر؟

غلط راستہ صحیح راستہ:

جنکی عقلیں منجمد ہیں، بحر الکاہل کی طرح جن کا اضطرابِ قلب غائب ہے، جن کا حاسۂ دینی سرد ہو چکا ہے، جو دنیا میں خود اپنی دریافت بھی آج تک نہیں کر سکے، جو شیطان کے سازشی مکر کے جال میں پھنسے، جو زوالِ عقل کی آخری سرحد کو پہنچ گئے، جنھیں اپنی قے سے نفرت نہ رہی، جن کے مذہب کی کوئی صحیح تعبیر آج تک نہ ہو سکی، جن کے پاس ناموں کے سوا سب کچھ جھوٹ کا انبار ہے، جن کے فہم و ادراک کا دریا ہمیشہ الٹا بہتا ہے وہی پہلا عقیدہ اختیار کر کے شیطان اور اپنی ترغیباتِ نفس کے ہتھے چڑھ کر اپنے خدا کی، اپنے نبیوں کی اور خود اپنے آپ کی بھی توہین کرتے ہیں اور سخت بے ادبی کرتے ہیں۔

لیکن جن کا دماغ صحیح ہے، جو شیطانی سازش کا شکار بننے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں، جو مذہب کو ایک پوشاک نہیں مانتے کہ جب چاہا اتار پھینکا بلکہ اساسِ توحید پر اللہ کی کتابوں سے معلوماتِ حق حاصل کرتے ہیں، جو مذہب کے جھینپ اور کھلاڑی مداری اور ایکٹر نہیں بلکہ حق کو سن کر جن کا دل پگھلتا ہے، جن کا ذوقِ سلیم ہر حجابات کا انکاری ہے۔ جو توحید کو کبھی بھی شرک کی تیاریاں تن کرنے کو راضی نہیں ہوئے جنھوں نے اپنے عقیدہ و ایمان کو ظلم و شرک کی گندگی سے ہمیشہ پاک رکھا ہے، وہ دوسرا عقیدہ اختیار کرتے ہیں جو عین دینِ فطرت اور عقلِ سلیم کے مطابق ہے اور اسی طریقے پر اللہ نے اپنے نبیوں کو دنیا میں راہِ حق دے کر بھیجا ہے۔

"قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین"

(۱۲۔ یوسف۔ ۱۰۸)

(کہو اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، خوب دیکھی بھالی راہ پر میں بھی اور جو میرے ساتھ چلنے والے ہیں وہ سب اللہ کی طرف ہی بلاتے ہیں۔ اللہ تو ہر عیب و نقص سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔

کلام ذوالجلال:

دعویٰ نبوت اور سیرت کی صداقت کے یہ تمام پہلو اگر کسی اہلِ ایمان کو قبول نہ ہوں تو اُسے لاکھوں لاکھ مرتبہ قرآن سے معذرت کرنی پڑے گی اور قدم قدم پر اس لافانی کلام ذوالجلال سے ٹکر لینی پڑے گی۔ لہٰذا ہر کسی مسلم و مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنے نبی برحق پر ایسا ہی عقیدہ رکھے جو اس کے خدا نے اور اس کے نبی نے اسے بتایا ہے۔ غلو کرنے والے اپنے غلو میں آگے بڑھ کر اپنے نبیوں کے بارے میں ایسے ایسے مضحکہ خیز اعتقاد کر بیٹھے کہ ان میں سے ہر ایک سے ان کا نبی چھین لیا گیا اور خداؤں کی فہرست میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ محسنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اس حق کا اعلان کیا کہ بشری لوازمات میں موت بھی انبیاء کے ساتھ لگا دی گئی ہے۔

"وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افائن مت فھم الخالدون ۰ کل نفس ذائقۃ الموت ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون ۰"

(۲۱۔ الانبیاء ۳۴/۳۵)

(اور ہم نے اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ زندہ رہنے نہیں دیا۔ تو کیا تم مر جاؤ گے تو یہ ہمیشہ رہ جائیں گے؟ ہر سانس لینے والا موت کا مزہ چکھ کر رہے گا۔ اور ہم نے تم کو تکلیف اور راحت کی آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ اور تم سب ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے)

یہ نہ ہوا کہ کوئی بھی نبی دنیا میں امر ہو کر رہ گیا ہو۔ رجوع الی اللہ سب کو لازم ہے۔ خلد اور ہمیشگی، دنیا کی مسلسل زندگی یا لافانی حیات تو یہاں کسی کو بھی حاصل نہیں۔ داغِ بندگی سب کی پیشانی پر لگا ہوا ہے۔ کوئی بھی مخلوق یہاں آکر موت کے شکنجوں سے برابر گذرے گی چاہے کوئی خدا کا نبی بھی کیوں نہ ہو۔ نزولِ قرآن کے وقت حضور کے مخالفین میں سے بہت سے بزدل لوگ یہ کہہ کر دم لینا چاہتے تھے کہ چلئے دو اس دعوتِ محمدی کو کب تک چلے گی؟ جب یہ وفات پا جائیں گے تو تحریک ختم ہو گا۔ اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے بھی جو کوئی نبی آئے ان میں سے ہمیشہ رہنے تو کوئی آیا نہیں۔ پھر تم مر جاؤ گے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ برہان، استدلالِ حق اور مشاہدہ اسے کہتے ہیں کہ جو بات کہی جائے سو فی صد صحیح ہو۔ (صدق اللہ مولانا العظیم)

ایک اور دلیل:۔

"وما ارسلنا قبلک الا رجالاً نوحی الیھم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۰ وما جعلناھم جسداً لا یاکلون الطعام وما کانوا خالدین ۰"

(۲۱۔ الانبیاء ۷/۸)

(آپ سے پہلے بھی ہم نے جس کسی کو رسول بنا بھیجا وہ آدمی یعنی مرد تھے (اور بازاروں سے چلتے تھے) جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی۔ اور ہم نے ان کو ایسا جسم تو دیا ہی نہیں تھا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں بلکہ ہمیشہ رہنے کے لئے بھی ان میں سے کسی کو موقعہ نہیں دیا گیا)

بستی میں رہنے والے:

قرآن نے جہاں ان آیات میں نبیوں کو دنیا کی زندگی میں بغیر طعام اور خلود کا جسم حاصل ہونے کی نفی کی وہاں دوسری جگہ انہیں اہلِ بستی یا گاؤں کے رہنے والے بھی بتایا کہ خدا کے نبی بھی عام انسانوں کے ساتھ ہی زندگی گذارنے والے تھے۔

"وما ارسلنا من قبلک الا رجالاً نوحی الیھم من اھل القریٰ"

(۱۲۔ یوسف ۱۰۹)

(اور اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے بھی جتنے رسول بھیجے وہ بھی انسانوں کی طرح بستیوں میں رہنے والے تھے)۔

خود ایک مقام پر حضور سے ایک دوسرے انداز پر خطاب فرمایا۔

"وما کنت ثاویاً فی اھل مدین تتلوا علیھم آیاتنا ولکنا کنا مرسلین ۰"

(۲۸۔ القصص۔ ۴۵)

(اور تم اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اہلِ مدین میں کسی جگہ سکونت پذیر بھی نہ تھے کہ انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتے، لیکن رسولوں کے بھیجنے والے تو ہم ہی رہے ہیں)۔

ثاویاً بھی تمہاری جائے سکونت یا مکان اور رہائش گاہ مدین میں تھی نہیں کہ انہیں ہماری باتیں سنا سکتے۔ یہ تو ہماری کار فرمائی ہے کہ جب جس جگہ جس کو چاہیں اپنا رسول بنا کر بھیجیں۔ اسی سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ رسول بھی رہنے کے لئے مکان

کا ضرورت مند ہے۔

ساحلِ مراد: جو شخص بھی ایک بار قرآن مجید پڑھے گا یا ذخیرۂ احادیث میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، سنن نسائی یا منتخب مجموعۂ احادیث مشکوٰۃ شریف یا حدیث کی سب سے قدیم کتاب مؤطا امام مالک یا صحیفۂ ہمام بن منبہ ان میں سے کسی ایک کتاب کو بھی آپ دیکھ لیں تو نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ حضور سرورِ کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم، والدۂ محترمہ، چچا، پھوپھی آپ کی ازواجِ مطہرات اور ان کے والدین، حضور کی بیٹیاں، بیٹے، آپ کے داماد اور نواسے نیز آپ کی خالائیں، ماموں وغیرہ کا تذکرہ آپ کا شجرۂ نسب والد کی طرف سے اور والدۂ محترمہ کے تعلق سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تاریخ میں محفوظ ملے گا۔ پھر آپکے بعد آپ کی اولاد، آپ کا خاندان (قریش) برادری اور آپ کا مدفن مدینہ طیبہ میں یہ سب باتیں کیا کسی غیر انسانی وجود کے لئے دلیل ہو سکتی ہیں۔ جاہلوں کی تاویل کو چھوڑ دیا جائے تو حضورؐ کی ذاتِ مبارک کوئی پُراسرار ہستی یا مہاتماؤں کی بھیڑ میں کوئی متناقض اجزائے فکر والی شخصیت نہ ہو کر عالمِ انسانیت کی ایک معلم و مزکیؐ، مربیؐ، ہمدرد، ہمدم، دم ساز، معرفتِ رب کا کھلا ہوا مکتب، عاجز و بے سہارا بندوں کے لئے رونے والا، مضطرب قلب، شجاعت کا عطر، گھائل انسانوں کو ہمت و ڈھارس دلانے والا، گنہگاروں کو توبہ کی خوشخبری و حیاتِ ابدی کی ضمانت دینے والا اور تمام بنی آدم کو ساحلِ نجات اور ساحلِ مراد پر پہنچانے والی واحد ذاتِ اقدس ہے۔

اور یہ بھی نہ بھولئے کہ تمام کے تمام نبی اللہ کے بندے اور رسول ہیں، سب کے سب بنی آدم ہیں، کوئی نبی کی اولاد ہے اور کوئی نبی کا باپ ہے۔ اور کوئی کسی کا بھائی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن کا ذکر بھی آپ کو قرآن میں ملے گا، حضرت موسیٰ کے بھائی ہارون اور آپ کی والدہ ماجدہ اور آپ کے خسرؑ کا ذکر بھی ملے گا۔ حضرت یوسف اور حضرت ابراہیم کے والد کا بھی ذکر آپ پائیں گے۔ حضرت زکریا اور لوط اور نوح کی بیوی کا تذکرہ بھی کسی کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتا۔ حضرت یعقوب بیٹے پوتے کہیں مفصل اور کہیں اجمالی طور پر حضرت داؤد و سلیمان دونوں باپ بیٹوں کا ذکر بھی ہر شخص دیکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ پھر قرآن کا یہ مجموعی نقطۂ نظر کہ انبیاء بنی آدم ہیں، بشر ہیں یہ عقیدہ کسی مسلمان کو اختیار کرنے میں ہرگز تامل نہ ہونا چاہیئے۔

ترازو کے تول سے حق واضح ہے، ہاں اگر کسی کے دماغ پر جاہلیت کا دورہ پڑا ہے اور اسکے عقیدے میں کیڑے پڑ گئے ہوں، جس نے اسلام کی حقانیت پر ترجیح دے کر جاہلی طرزِ زندگی کو اختیار کیا ہو، وہ قرآن و حدیث کے دلائل کے لشکروں کو شکست دینے کی مذموم کوشش کی بجائے اچھا ہو کہ اسلام چھوڑ کر کہیں اور چلتا بنے یا غلط عقائد کی اپنی سلگائی ہوئی آگ میں خود ہی جل کر کیل ہو تو بہتر ہو...

غزل

ہر کلی کے قلب میں اک آتشِ بے نام ہے
وہ تو یہ کہئے چمن میں فیضِ شبنم عام ہے
ہر طرف شہرت یہ ہے ساقی کا فیضِ عام ہے
جانے کیوں رِندوں کے ہونٹوں پر سوالِ جام ہے
مسکراہٹ رسم بن کر رہ گئی ہے ہر روِش
اب تو پھولوں میں بھی رنگِ گردشِ ایام ہے
ان کے وعدوں پر بھروسہ ہے مجھے لیکن ابھی
جیسے یہ محسوس ہوتا ہے پرانی شام ہے
اک نہ اک دکھ سب کے چہرے پر نیاں ہے مگر
وضعداری ہے کہ ہم کہتے رہیں آرام ہے
امتیازِ نور و ظلمت جس میں ممکن ہی نہیں
دوستو ایسے سویرے سے تو اچھی شام ہے
میکدہ اپنا ہے لیکن ہائے نظمِ میکدہ!
لوگ ہم سے پوچھتے ہیں آپ کا کیا نام ہے
خامشی بھی جرم ہے تسنیمؔ صاحب اس لئے
شہر کے ہر حادثے کا آپ پر الزام ہے

بقیہ صفحہ ۱۲: سوزِ حیاتِ ابدی میں تبدیل ہو جانا چاہئے اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے، وہ شمع شرر نہیں کر جلا اور بجھ گیا اور اسکے ساتھ ہمیں کوئی اعتقادی تعلق بھی ہونا چاہئے

علومِ اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں: جہاں علومِ اسلامیہ کا تعلق ہے آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر مقالے پڑھ سکتے ہیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ سب جانتے ہیں کہ میرا اس مکتبِ خیال سے تعلق ہے جو اجتہاد کو دائمی ضرورت سمجھتا ہے یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کے تعطل کے اسباب کیا تھے کہاں تک جائز تھے یا غیر جائز تھے اس میں اختلاف ہو سکتا ہے جہاں تک اجتہاد کی ضرورت کا تعلق ہے ہر کوئی پڑھا لکھا اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے، یہ الگ بات ہے اس کی اہلیت کے شرائط ایسے قرار دیں کہ اس کا مصداق ہی کوئی نہ پیدا ہو۔

لیکن میں ایک بات کہوں گا جہاں تک علومِ اسلامیہ کا تعلق ہے اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ اصل سرچشمہ وہی ہے اس لئے ہمارا طرز اس بارے میں یہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم صرف بحث کر رہے ہیں اور ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ ہمیں اس سے اتفاق بھی نہیں۔ تو اکمیہ حد تک اتفاق بھی ہونا چاہئے اور اگر وہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے تو اس پر ایمان بھی ہونا چاہئے اور کسی حد تک اس کی ہماری عملی زندگی میں اسکی نمود بھی ہونی چاہیئے۔ میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مثال سُنا کرتا تھا کہ، "یک من علم را دہ من عقل باید" ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہئے ورنہ آدمی اس کا صحیح استعمال نہ جانے گا۔ تو میں یہ ترمیم کروں گا کہ یک من تحقیق را تولہ ماشہ ہی کی مقدار میں تقویٰ بھی ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ یہ مسئلہ علومِ اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے پیوستہ ہو جاتا ہے، اگر ہم اس پر اس طرح سے عمل جراحی کرتے ہیں ایک سرجن (surgeon) کا نشتر جس طرح سے چلتا ہے۔

تنقید میں کسی قسم کی توہین آمیز تضحیک کی شان نہیں ہونی چاہئے کہ تضحیک یا طنزیات کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں۔ آپ کا اپروچ (APROCH) خالص علمی (scientific) خالص اکیڈمک (Academic) ہو۔ قلم پکڑیں تو آپ کو اول سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہئے جس نے اپنا وقت صرف کیا جس نے اپنی آنکھیں خراب کیں جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیت: عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے اگر آپ کو علومِ اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے ڈس کوالیفیکیشن (Disqualification) کی بات ہو گی کہ آپ عربی سے بالکل نا آشنا ہوں۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمینار ہو رہا تھا اس میں ایک صاحب جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، تقریر کر رہے تھے، تو مشہور عرب ادیبہ اور مورخہ عائشہ بنت شاطی نے جو اس سیمینار میں شریک تھیں ان سے عربی میں خطاب کیا تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جا کر انہوں نے مسلسل قسطیں مصر کے کثیر الاشاعت اخبار "الاہرام" میں لکھیں کہ میں نے عجائبات میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔ آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس چیز پر قابو پا سکتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عربی سے ترجمہ

جائے وقوع: مشرقی ایشیا کا جنوبی حصہ۔

رقبۂ سلطنت: ... ۱۱۴ مربع میل ہے۔ فلپائن سات ہزار جزائر پر مشتمل ہے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی اکثریت ہے جنمیں انسانی آبادی کا وجود ہی نہیں۔

آب وھوا: سردی اور گرمی دونوں کا اعتدال ہے۔

آبادی: ۳۸ ملین ہے جسمیں مندرجہ ذیل ادیان و مذاہب کے ماننے والے افراد پائے جاتے ہیں۔

(۱) ۳۲ ملین عیسائی آبادی ہے جس میں ۳۰ ملین کیتھولک مسیحی اور ۳ ملین دیگر عیسائی فرقوں کے پیرو ہیں۔

(۲) ۴ ملین مسلم آبادی ہے۔

(۳) باقی بت پرست آبادی ہے۔

اقتصادی حالت: یہ ملک قدرتی ذرائع آمدنی سے مالا مال ہے۔ زراعت اس ملک کی اقتصادیات میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ آجکل تیزی کے ساتھ یہ ملک صنعت و حرفت کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

فلپائن میں اسلام کا آغاز: فلپائن میں دخولِ اسلام کی کوئی قطعی تاریخ مؤرخین و محققین کے یہاں نہیں ملتی مختلف رائیں سامنے آتی ہیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ ادیانِ سماویہ میں سرزمین فلپائن پر سب سے پہلے اسلام ہی کے قدم پہونچے تیرہویں صدی عیسوی میں اس ملک میں اسلام کی آمد ہوئی لیکن بہت سے ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اس سے بہت پہلے سے اس سرزمین کو اپنی شعاعوں سے منور کر رہا ہے۔ مشہور مسلم سیاح ابن بطوطہ ایک مسلم عورت فرمانروائے سلطنت کے زمانہ میں اس ملک کی سیاحت کر چکا ہے۔

فلپائن میں دخولِ اسلام کے ذرائع: فلپائن میں اسلام کیسے داخل ہوا اس سلسلے میں بہت سی رائیں ہیں جنمیں تین قابلِ ذکر خیالات تحریر کئے جاتے ہیں۔

(۱) **بذریعۂ تجارت:** وہ مسلم تجار جو جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اسلام کی تبلیغ و ترویج کا بھی سامان لیتے گئے انہوں نے اس زمین کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرا کے اس کے چپہ چپہ کو روشن و منور کیا۔

(۲) **براہِ سیاست:** جب بہت سے ملادی امراء و حکام اور اصحابِ ثروت کو انکے حریفوں نے جبراً نکال باہر کیا تو ایک وسیع زمین اور محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں وہ اس خطۂ ارض تک پہونچے اور قابض ہو کر اپنی سلطنت کے حدود میں اضافہ کرتے رہے انہوں نے اپنے عادلانہ نظامِ حکومت سے اسلام کی تبلیغ و ترویج کی اور عوام و خواص میں اس کی برکتیں پھیلا کر دینِ حق کی طرف مائل کیا۔

(۳) **بذریعۂ تبلیغ وھدایت:** خدا کے نیک بندے جن کے دلوں میں فریضۂ دعوت و تبلیغ کی بجا آوری کا جذبہ ہر وقت انگڑائیاں لیتا رہتا تھا وہ اس دور دراز علاقے میں اشاعتِ اسلام کے جذبۂ بیکراں کے ساتھ نکل آئے اور غیر مسلموں کو اپنی حکمت و موعظت سے اسلام کی طرف راغب کیا۔

لیکن اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ تینوں اسباب مجموعی طور پر اشاعتِ اسلام کے ذرائع ثابت ہوتے ہیں کسی ایک کو واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسپینی جنگ: سولہویں صدی عیسوی میں اسپین نے فلپائن پر قبضہ کر لینا چاہا۔ اُسے یہ خیال اس دریافت کے بعد ہوا جب "ماجلین" کی سربراہی میں ایک دستے نے جزیرۂ "سیبو" اس وقت ایک بت پرست کی حکمرانی تھی بعد میں یہ حکمران ماجلین کا مطیع ہو کر دینِ نصرانیت میں داخل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پورا ملک ان کی حدودِ سلطنت میں داخل ہو گیا۔ اسپین نے اوائل سترہویں صدی سے لیکر اواخر انیسویں صدی تک فلپائن پر باقاعدہ حکمرانی کی صرف جنوبی حصۂ فلپائن انکی حدودِ مملکت سے باہر تھا جس پر ایک مضبوط اسلامی حکومت تھی۔ اسپینی سامراجیت نے اس اسلامی ریاست کو ہڑپ کرنے کے لئے پوری طاقت داؤ پر لگا دیا، لیکن باوجود ہزار کوششوں اور سازشوں کے وہ اپنے اس مقصد میں بُری طرح ناکام رہے۔

فلپائن میں صرف دو بڑی بڑی اسلامی ریاستیں تھیں جو اسپینی اقتدار سے محفوظ تھیں اُن کے نام یہ ہیں:

(۱) صولو (۲) ماجیندانو

ان کے علاوہ بھی "منداناو" کے علاقے میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں ان دونوں مذکورہ اسلامی ممالک اور اسپین کے درمیان اس کے پورے عہدِ حکومت تک اسلام و نصرانیت کے درمیان جنگ ہوتی رہی۔

اسپینی و امریکی جنگ: ۱۸۹۶ء میں امریکہ و اسپین کے درمیان ایک ہیبت ناک جنگ چھڑ گئی ہوا یوں کہ مانیلا میں ایک اسپینی بحری بیڑا لنگر انداز تھا جس پر امریکی بحریہ نے حملہ کر دیا اور پھر دونوں باہم برسرِ پیکار ہو گئے۔ اس علاقے میں کچھ حریت پسند فلپائنیوں نے اسلام کے خلاف جنگ آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور بہت سے علاقے اس کے ہاتھ آ بھی گئے تھے پھر ان انقلابیوں نے امریکی فوج کے سہارے "مانیلا" پر بھی قبضہ کر لیا لیکن امریکیوں نے ان انقلابیوں کے ساتھ عہد شکنی کی، ان میں معاہدہ یہ تھا کہ اسپین کی شکست کے بعد فلپائن ایک آزاد و مختار سلطنت ہو گی ۱۸۹۸ء میں اسپین و امریکہ کے درمیان پیرس میں یہ معاہدہ ہوا کہ فلپائن کی تمام مسلم ریاستوں کو امریکی حدودِ سلطنت میں شامل کر لیا جائے لیکن مسلمانوں اور فلپائنیوں نے اس معاہدۂ پیرس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بھی امریکہ کے خلاف ایک معاہدہ ہو چکا تھا لیکن امریکیوں نے ان دونوں کے درمیان تفرقہ و عدمِ تعاون کی فضا پیدا کر کے اسے بُری طرح ناکام کر دیا۔ تاہم مسلمان ان کے خلاف برابر برسرِ پیکار رہے۔

امریکیوں سے جنگ: امریکی فوج نے مسلمانوں کے علاوہ تمام ہموطنوں کو کسی نہ کسی طرح زیر کر ہی لیا مسلمانوں میں بھی رشوت، مکر و فریب، عہد شکنی کے تمام حربے استعمال کر ڈالے لیکن مسلمان بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک برابر ان سے مقابلہ کرتے رہے۔

مسلمان امریکیوں کے زیرِ حکومت: اسپین و امریکہ کے خلاف مسلسل جنگ کی وجہ مسلمان عددی اعتبار سے کم ہوتے رہے اور اپنی پوری صلاحیت دفاعی محاذ پر خرچ کرنے کی وجہ سے زندگی کے دیگر میدانوں میں آگے نہ بڑھ سکے لیکن تعجب خیز اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ وہ ان تمام مسلسل جنگوں کے باوجود اسلام پر قائم و دائم رہے اور کسی طرح بھی اپنے مخصوص شعائر و روایات سے دست بردار نہ ہوئے۔

۱۹۳۵ء سے امریکیوں نے ایک نیم آزاد حکومت کی بنا ڈالی ہے اور یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ فلپائن جلد ہی ایک آزاد فضا میں سانس لے گا اس نئی حکومت سے انضمام کو یہاں کے بہت سے مسلمان اس امید پر گوارہ کئے ہوئے ہیں کہ کم از کم ان کے حقوق اور غصب شدہ جائدادیں مل جائیں گی۔ بالخصوص وہ ایک ایسی حکومت کے زیرِ اثر زندگی بسر کر سکیں گے جو عدل و انصاف اور دستوری قوانین کا پاس و لحاظ رکھے گی لیکن دانشور مسلمانوں نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ صرف معاہدے، نمائندگیاں اور قومی دھارے میں بہہ جانا ان کی رہی سہی پوزیشن کے لئے بھی زہرِ قاتل ہوگا۔

تحریکِ مسلمانانِ فلپائن: فلپائن میں مسلمانوں کی سب سے پہلی تنظیم "جمعیۃ مسلمانانِ فلپائن" ہے۔ جس کی داغ بیل غیر فلپائنی مسلمانوں نے ڈالی ہے جن میں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو بسلسلۂ تجارت یا کسی اور پیشہ کے تحت مانیلا میں مقیم ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مقامی مسلمانوں نے بھی اس کی اہمیت و ضرورت محسوس کیا اور اس کام کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کی مہم شروع کی اور اسے اس منزل تک لائے کہ وہ ان کی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی معاملات میں بھی رہنمائی کی فرائض انجام دے سکے اس جمعیت کے واسطے سے بلادِ اسلامیہ و مسلمانانِ عالم سے بھی اسکے روابط پیدا ہوئے۔

اسلام کے خلاف سازشیں اور مسلمانوں پر مظالم

مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کا ایک بربریت سلسلہ ۱۹۷۰ء کے آخر میں شروع ہوا اور یہ سلسلۂ قتل و ہلاکت آج بھی تیزی کے ساتھ پھیلتی رہی اب تو مقاماتِ مقدسہ اور مسلمانوں پر اکثر علاقوں میں حملے ہونے لگے ہیں اس ظلم و بربریت کے پیچھے نیم فوجی جماعت "آئلا" کا پورا پورا ہاتھ ہے جو فلپائنی فوج کے سہارے مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم ڈھاتی رہتی ہے۔ ایک خبر کے مطابق ان مظالم کے شکار مسلم مرد اور عورتوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے اور وہ مسلمان جو اپنے وطن عزیز سے نکالے جا چکے ہیں ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار ہے اور جن علاقوں سے انہیں نکالا گیا ہے ان کی پیمائش کی جائے تو مجموعی رقبہ لبنان سے بھی بڑھ جائے گا۔

فلپائن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۴ لاکھ ہے۔ اکثر مسلمان فلپائن کے جنوبی حصے میں آباد ہیں، ہم وطنوں کے اعتبار سے ان کی آبادی دس فیصد

ہے ویسے فلپائنی مسلمان ان مشکلات و مصائب سے قطعاً خوفزدہ نہیں جو کبھی ان کی راہ میں ہر وقت پیدا کرتے رہتے ہیں ان مشکلات میں سرِ فہرست یہ ہے کہ عیسائی مسلم علاقوں اور زمینوں پر قبضہ کرنے کی برابر خفیہ تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں وہ زمین جس پر ان کے آباء واجداد صدیوں سے کاشت کرتے چلے آرہے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی صبح جب وہ خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو کسی عیسائی کے قبضے میں پاتے ہیں تعلیمی میدان میں کم ہی مسلمانوں کو اس کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ زیورِ علم سے آراستہ ہوسکیں بہت سے ایسے ادارے بھی ہیں جن میں مسلم طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے مسلمانوں کی ایک مختصر سی تعداد اونچے کاموں اور مناصب سے وابستہ ہے ورنہ وہ زراعت اور معمولی کاموں ہی کے ذریعہ اپنا گذر بسر کرتے ہیں۔

فلپائن میں مسلمانوں کا قتلِ عام:

متعصب غیر مسلم فلپائنیوں کی طرف سے روزانہ کسی نہ کسی مسلمان پر ظلم وستم ڈھائے جانا ایک معمولی سی بات بن کر رہ گئی ہے یہ مظالم متعدد طرح کے ہوتے ہیں جو عام طور پر قتل۔ اغوا۔ گھروں اور جائدادوں پر حملے اور مساجد میں مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کی شکل میں رونما ہوتے رہتے ہیں جس کا مقصد صرف یہ ہے یہاں سے اسلام اور مسلمانوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ خبر سنکر آپ کا سارا وجود لرز جائیگا کہ پانچ سو مسلم خاندان جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے چھانتے بھوک وپیاس اور ٹھنڈک کی شدت سے موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ سب سے وحشت ناک خبر جو متعصب فلپائنیوں پر حکومت کی پشت پناہی کا راز فاش کئے دیتی ہے وہ ۱۵۹ مسلم نوجوانوں کا "کوریجڈور" کی فوجی چھاؤنی میں قتلِ عام ہے۔ ہوا یہ کہ حکومت نے ہر مسلم خاندان سے فوجی ٹریننگ کے لئے ایک ایک نوجوان کا انتخاب کیا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ روح فرسا خبر ملی کہ ایک کے علاوہ وہ بقیہ تمام نوجوان ان کے ظلم وبربریت کے ہاتھوں شہید ہوچکے ہیں جس کے بعد یہ شرمناک سازش بے نقاب ہوئی کہ حکومت نے ٹریننگ کے لئے نہیں بلکہ انہیں اس مقصد سے بھرتی کیا تھا کہ کوئی بھی ایسا مسلم نوجوان نہ بچ سکے جو تعلیم حاصل کرنے یا ہتھیار اٹھانے کے لائق رہ جائے۔ اسی طرح "سوبہ داو" میں وہ فوج جس کا نام "ایلا جا" ہے اس نے بہت سے مقامات اور کھیت جلا کر خاکستر کرڈالا ہے "یاقوت" میں اسی فوج کے اشتراک سے پولیس نے بہت سے دیہاتوں کے کھیت جلائے اور پانچ مساجد میں آگ لگا دی تھی۔ اسی طرح کے واقعات "اوبر" میں بھی پیش آئے جس میں دس عورتوں کو ان کے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ نذرِ آتش کردیا گیا۔

ظلم ونظام کی طویل داستان کے اس ناممکمل باب ہی سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ حکومت کا جاسوسی اور انتظامی عملہ بھی ان بلوائیوں کی اچھی طرح پشت پناہی کررہا ہے پولیس کا یہ حال ہے کہ کوئی مسلمان اگر لاٹھی یا اس طرح کا کوئی سامان لے کر انکے سامنے سے گذر جاتا ہے تو اسے فوراً گرفتار کرلیتی ہے اور یہ غیر مسلم فلپائنی بندوق لے کر بھی آزادانہ گھومتے ہیں تو انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔ مسلمان اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ اس وقت جنوبی فلپائن سے ان کی بیخ کنی کی منظم کاروائی کیجارہی ہے۔ فلپائنی مسلمان آج ایک ادنیٰ شہری کی حیثیت سے رہتا ہے۔ کسی بھی اہم اور قائدانہ منصب کا حصول گویا اس کے لئے ممنوع ہے۔ عسکری محکمہ میں جنرل ہمیشہ عیسائی ہوتا ہے اور مسلمان صرف فوجی تعلیم وملازمت کے مواقع مسلمانوں کے لئے بہت تنگ ہیں۔ تعلیم کا تو یہ حال ہے کہ چار سو مسلم طلبہ پر صرف ایک مدرسہ ہوتا ہے اور پانچ لاکھ مسلم شہریوں کے لئے صرف ایک ہاسپٹل جس میں ۵۰ بیڈ اور صرف ایک سول سرجن ہے۔ مسلمانوں کے گھر معمولی درجے کے ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں عربی زبان اور قرآن کریم کا پڑھنا اکثر علاقوں میں ممنوع ہے۔

مسلمانانِ عالم کے لئے ایک زبردست چیلنج

فلپائنی مسلمانوں کے حالِ زار کا مطالبہ ہے کہ اسلامی ممالک ان کے ساتھ ہونے والے مظالم کی روک تھام کے لئے اپنی جد وجہد کا آغاز کریں۔ اگر بلادِ اسلامیہ نیک نیتی وہمدردی کے ساتھ اپنے وافر وسائل وذرائع کا استعمال کریں تو بہت جلد فلپائنی حکومت پر دباؤ ڈال کر ان مظالم کا سلسلہ بند کرا سکتے ہیں آج اقوام متحدہ اور ادارہ برائے حقوق انسانی کے ہوتے ہوئے بھی وہاں جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں وہ ان کے ذمہ داروں اور دیگر اربابِ بست وکشاد کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم اس المیہ کے باوجود دیکھتے ہیں کہ مسلم ممالک ابھی تک خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں اور صیہونیوں وعیسائی مشنریوں کا ان متعصب بلوائیوں کو پورا پورا تعاون حاصل ہے کہ وہ مسلم جہاں آج سے صدیوں پہلے اسلام کے قدم پہونچے تھے وہاں سے اسے نکال باہر کردیا جائے۔ بشری دشمنوں کے لئے دروازے کھول دئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان اسرائیلیات وخرافات کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ اسلامی احکام وقوانین کو ساقط العمل قرار دیا جارہا ہے اور مسلمانوں پر وہ سول کوڈ جبری طور پر نافذ کیا جارہا ہے جس کی رو سے کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا اور مسلم عورت کسی بھی غیر مسلم مرد کے ساتھ بلا روک ٹوک شادی کرسکتی ہے۔ مسلمان شہریوں کے ساتھ دوسرے درجے کا سلوک کیا جارہا ہے اور تعلیم وصحت کے میدان میں انھیں انکی حاصل شدہ سہولیات بھی ختم کی جارہی ہیں۔

آغاز امر میں کیتھولک عیسائیوں نے مساجد میں مسلمانوں پر حملے کئے، انھیں ذبح کیا، بازاروں سے اغوا کیا اور قتل وبے آبروئی کی گئی گھروں کو اجاڑا گیا بار بار انھیں گرفتار کیا گیا اور گولیاں چلائی گئیں پھر بھی حکومت نے دنیا کو یہ باور کرانا چاہا کہ حکومت کا ان ظالموں سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے بعد تو اس نے طرح طرح کے الزامات عائد کرکے مسلمانوں کو دھمکیاں دینی شروع کیں اور کھل کر کیتھولک عیسائیوں کا ساتھ دیا اور فوج اور پولیس کو جدید اسلحوں سے لیس کردیا کہ وہ ان بچے کچھے مسلمانوں کا بھی صفایا کردے جو اپنی زندگی بچانے کے لئے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپتے پھر رہے ہیں۔

فلپائنی مظالم دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیت کو نیست ونابود کر دینے والی سازشوں کو دوبارہ بے نقاب کئے دے رہے ہیں اور دنیا کے بیشتر حصوں میں ہماری تہذیب وتمدن اور اسلامی اقدار وشعائر کو ختم کرکے اسلام دشمن عناصر مسلمانوں کی بنیاد اکھیڑ کر اپنے اندر ختم کرلینے کی سازشوں کو ان مظالم کے ذریعہ جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہ رہے ہیں۔

فلپائنی حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے قتل وجلاوطنی کی دھمکی

فلپائنی حکومت نے جنوبی حصے میں سکونت پذیر مسلمانوں کو دو زبردست دھمکیاں دی ہیں۔

(۱) مسلمان اپنے اسلحے حکومت کو سپرد کردیں۔

(۲) حکم عدولی کی صورت میں فلپائنی حکومت ان کے ٹھکانوں کو مسمار کردے گی اور انھیں جبراً خالی ہاتھ کردے گی۔

ایک مسلم لیڈر پروفیسر ابراہیم اسماعیل نے اپنے ایک اعلان میں یہ بتلایا ہے کہ جنوبی حصے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والے اور انھیں دھمکی دینے والے تمام بلوائیوں کے ساتھ پورے طور پر ملے جلے ہیں یہ بھی بتلایا کہ "مانیلا" سے جو فوج مسلمانوں کے مقابلے کے لئے "کوتاباتو" بھیجی گئی ہے اسمیں سے ۲۰ مقتول ہوئے ایک ٹینک اور ہیلی کوپٹر مار گرایا گیا۔ فلپائن نے "کوتاباتو" میں اپنی فوج کو اسلحے کے ساتھ ایک نئی کمک بھیجی ہے مسلمانوں نے ان دہشت پسند کاروائیوں سے تنگ آکر ایک علاقے پر اپنا قبضہ کرلیا جب مسلمانوں نے اپنا قبضہ کرلیا تو حکومت نے دنیا میں اس الزام کا پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیا کہ مسلمان جدید اسلحوں سے مسلح ہیں۔

اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ پر متعین ہے کہ متعصب کیتھولک عیسائیوں کے ذریعہ سے حکومت ان مظالم کو شہ دے رہی ہے اور اس کے جملہ انتظام وانصرام کی وہ خود ذمہ دار ہے۔ ●●

بقیہ صفحہ: انتشار سے احتراز کیجئے! یہ دور انتشار ہے اسوقت طبیعتیں انتشار کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں اور میں یہ بھی عرض کردوں کہ انسان سہولت پسند ہمیشہ سے واقع ہوا ہے، جدید تمدن نے سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیارِ زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے۔ اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں کہ جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

میں نے اپنے بعض انٹرویو میں جب ۶۷ء کی جنگ میں عربوں کو شکست ہوئی تو کہا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند ادباء اور مصنفین پر ہے جنھوں نے ہماری جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا، تمام قدیم اقدار کو انہوں نے متزلزل کردیا۔

میں شکر گذار ہوں وائس چانسلر صاحب، پرو وائس چانسلر صاحب اور ان سب حضرات کا جو اس سمینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار کیا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سمینار میں کہا، مخلصانہ کہا۔ خدا کرے کہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جوہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔

قابلِ توجہ

"تعمیرِ حیات" کی قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات مستفید ہوسکیں۔ اس لئے اہلِ استطاعت حضرات سے پُر زور گذارش ہے کہ حوصلہ مندی سے عطیات عطا فرماکر دینی لٹریچر کی نشر واشاعت اور ادارہ کی اعانت میں حصہ لیں۔ ان حضرات کی خدمت میں "تعمیرِ حیات" برابر ارسال کیا جائے گا۔

معاونینِ خصوصی ولائف ممبر -/500 معاونین -/250 اعزازی خریداران سالانہ -/50

(منیجر)

طلبائے ندوہ کی انجمن "الاصلاح" نے توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مشاہیر اپنے مقالات یا تقریروں سے دارالعلوم ندوہ کے طلباء کو مستفید کریں۔ اس سلسلہ کے ایک جلسہ اردو زبان صاحبِ اسلوب ادیب، انشاپرداز اور طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے اسلوب میں "عزیزانِ ندوہ کے نام" یہ گراں بہا مقالہ پیش کیا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا عبدالماجد دریابادی نے فرمائی اور افتتاح ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا۔ پروفیسر رشید صاحب کے طویل مقالے کے چند اقتباسات:-

عزیزانِ ندوہ کے نام

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

نظم وضبط اور خوش سلیقگی:

آپ جہاں رہیں جس طرح رہیں اور جس لئے رہیں وہ سب کسی اعلیٰ عقیدہ، مقصد یا تصور کی خاطر ہو۔ ذمہ داری کی زندگی بسر کرنا ڈسپلن ہے۔ اگر آپ مسلمان کی ذمہ داری سے واقف ہیں تو آپ کو ڈسپلن کا مفہوم وماہیت سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ مجردات سے ہٹ کر آپ کو چند معمولی اور معمولی اور موٹی باتوں کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ ان سب کا تعلق ڈسپلن یا آپکی سیرت (کیریکٹر) کی پرداخت سے ہے۔ آپ پڑھنے لکھنے اور اچھی باتیں سیکھنے اور برتنے میں اس طرح کوشش کریں جیسے آپ وہ قرض اُتار رہے ہوں جو آپ کے سرپرست عزیز یا دوست روپے یا پیسے سے شفقت یا محبت سے اور معلوم نہیں کتنی سختیاں جھیل کر آپ کو فراغت وعزت سے زندگی بسر کرنے کے لئے سامان اور سہولتیں فراہم کرتے رہتے ہیں جو موجودہ دور میں متوسط (بالعموم تنگدست) مسلمانوں گھرانوں کے لئے بہت دشوار ہے صحت کو برقرار اور حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھئے اور نارمل زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالئے، ستھرے سادے خوش قطع لباس پہنئے خواہ ان میں پیوند ہی کیوں نہ لگے ہوں۔

آپ کے لئے دارالعلوم کی طرف سے کوئی یونیفارم مقرر کردیا جائے تو بہتر ہوگا۔ یونیفارم کا احترام آدمی کو بے راہ روی سے روکتا ہے، جس طرح با وضو رہنے سے منہیات اور خرافات سے بچتا رہتا ہے۔

مقررہ وقت پر ستھرے کشادہ ہوادار مناسب طور پر آراستہ خوش منظر ڈائننگ ہال میں سادہ صحت مند اور خوش ذائقہ کھانا سب کے ساتھ بے داغ سفید برتنوں اور دسترخوانوں پر تناول کیجئے۔

عمارات اور باغات:

دارالعلوم کی عمارتوں میدانوں باغات اور سبزہ زار کو زیادہ سے زیادہ کشادہ صاف ستھرا اور خوش نما ہونا چاہئے اور اساتذہ سے زیادہ اور کون ایسے پُر فضا اور صحت بخش گرد وپیش کا مستحق ہوسکتا ہے۔ یہ ماحول اور فضا اہمیت میں اچھی کتابوں اچھے نگراں اچھے ساتھیوں اور اچھے اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں۔ ماحول کا اثر براہ راست اور غیر شعوری طور پر طلباء کے ذہن اور ذوق پر پڑتا ہے ذمہ دار اصحاب کو یہ نکتہ برابر ذہن میں رکھنا چاہئے۔ آپ کا ادارہ اسلامی ہے، مسلمانوں کی مخصوص وممتاز روایات سے آپ سے زیادہ اور کون واقف ہوگا۔ مسلمان جہاں گئے یا جائیں گے خوشنما عمارات، باغ نہر آبشار سڑک اور سبزہ زار کے بغیر نہیں رہیں گے۔ مسلمانوں کی تمام خدمات نظرانداز ہوجائیں یا کردی جائیں تو انکے ذوق وذہن کے اس رجحان سے انکے تمام کارناموں کی از سر نو بازیافت ہوسکتی ہے۔

کھیل: امید ہے کہ مغربی کھیلوں مثلاً کرکیٹ، ٹینس، ہاکی، فٹ بال کے حق میں ہونگے یہ اس لئے کہتا ہوں کہ میں کشتی کبڈی گتکی ڈنڈا جمناسٹک وغیرہ کے حق میں نہیں ہوں۔ بالخصوص مشرقی علوم کی اعلیٰ درسگاہوں میں جیسی کہ آپ کی ہیں۔

مغربی میدانی کھیلوں کی اہمیت پر اس لئے زیادہ زور دینا چاہتا ہوں کہ دین ومذہب کی تعلیم جن روایات کے تحت جس طرح جن حالات اور ماحول میں دی جاتی ہے وہ طالب علم کی مناسب حال تربیت کے لئے سازگار نہیں ہوتی حالانکہ اس نوعیت کی تعلیم کے لئے خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ طالب علم میں وسیع النظری رواداری ہمدردی اور حوصلہ مندی آئے اور وہ دوسرے کے نقطۂ نظر کے صحیح اور اپنے نقطۂ نظر کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرنے میں جھجک نہیں بڑائی محسوس کرے۔

یہ دو طرح سے پیدا کی جاسکتی ہے ایک ایسے کھیلوں سے جن میں کھیلنے والوں کی تعداد کافی ہو کھیل اپنے آئین وضوابط اور روایات کے اعتبار سے مکمل ہو نیز دیکھنے میں کھیل اور کھلاڑی دونوں شائستہ نظر آئیں۔ یہ شرائط صرف وہ مغربی کھیل پورا کرتے ہیں جن کا ذکر آچکا ہے۔

مادرِ علمی کی خدمت: آپ کے منتخب طلباء تنہا یا وفد کی شکل میں تعطیلوں میں مقررہ حلقوں کا دورہ کرکے اپنے نادار لیکن ہونہار ساتھیوں کے لئے اہلِ خیر سے عطیات حاصل کیا کریں۔

یہ طلباء اس مبارک خدمت کے علاوہ آپ کے ادارے کے بڑے اچھے سفیر ثابت ہوں گے۔

اس کا بالکل خیال نہ کیجئے کہ موجودہ حالات میں چندے کا ملنا دشوار ہے۔ جو مل جائے وہی کافی ہے۔ زیادہ تر اس پر نظر رکھئے کہ اس طرح آپ کے ادارے کی نیک نامی پھیلے گی اور یہ کارنامہ آپ کے طلباء کا ہوگا جن کی گوناگوں تربیت کا یہ بڑا مبارک وموثر وسیلہ ہے۔ طلباء کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ ذہنی خانقاہوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں سانس لینے کا حوصلہ کریں۔ اور اس کا ان کو موقع دیا جائے۔

پہاڑوں پر زیادہ سے زیادہ بلندی تک پہونچنے کی جو سعی کیجاتی ہے وہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان بلندیوں تک پہونچنے کے لئے جس طاقت یا صلاحیت کی ضرورت ہے وہ انسان میں کتنی ہے اور کس طرح اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

طلباء کی انجمن: طلباء کے خیالات وجذبات کی صحت وصفائی کے لحاظ سے تعلیم گاہوں میں یونین کلب یا انجمن اتحاد کو میں وہی حیثیت دیتا ہوں جو انسانی جسم میں پھیپھڑے کو حاصل ہے۔ طلباء کی نارمل زندگی میں یونین کلب کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے کھانے پینے نہانے دھونے ورزش تفریح اور سیر وشکار کی۔ اچھے یونین کلب کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہاں نوجوانوں کو جس جرأت اور وقار کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے اسی طرح تحمل اور بردباری سے فریق مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی پابندی ہوتی ہے اگر کوئی یونین یا اس کے اراکین اس خصوصیت کو پورا نہیں کرتے تو پھر وہ یونین یونین نہیں ہے۔ نا اہلوں کا الزام ہے یونین میں ہر موضوع پر اظہار خیال کی آزادی ہونی چاہئے۔ لیکن اس آزادی کو کسی حال میں ذمہ داری کے حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہئے اگر کسی وبا کے سبب یونین سیاحت کے بجائے مجادلے کو اپنا شعار یا مقصد بنالے تو پھر اسکی حیثیت درسگاہ کے جس میں مرکزِ تعلق کی ہوجاتی ہے اور اس کا تدارک لازم آجائے گا پچھلے دنوں اس طرح کے سانحے کثرت سے دیکھنے میں آئے لیکن اس صورت حال سے بددل نہ ہونا چاہئے۔ لعنت بھیجنے میں مضائقہ نہیں اس لئے کہ اسی میں فتنہ وفتور کو دخل ہے جوان کے بزرگوں کے نازیبا اعمال میں کالے ہیرے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

صدر جلسہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے فرمایا:

"تقریر دلپذیر ایک مردِ گویا کی ابھی آپ کے سامنے ہونے کو ہے۔ اس جلسہ کی صدارت کے لئے آپ نے انتخاب کیا خوب، ایک گونگے کا کیا ہے! میں ایک گوشہ نشین، خیر، قلم کا گھسنا تو کچھ تھوڑا بہت جانتا بھی ہوں، لیکن زبان آجتک نہ چلانا آئی نہ ہلانا آئی! یہ صدارت تو آپ نے زبردستی ٹھونس دی ہے۔ ایسے مولانا علی میاں اور محمد اویس نگرامی کی عین ستم ظریفی نہ کہوں، تو اور کیا کہوں! صورتیں اتنی ثقہ، سیرتیں اتنی پاکیزہ، لیکن جب زندہ دلی کا شگوفہ چھوڑنے پر آئیں تو اچھے اچھے دل لگی بازوں کو نیچا کر دکھائیں ـــ! عجب نہیں کہ یہ معنوی تصرف خود جناب رشید کا ہو۔

میں اس مقالہ کا عنوان کرنے کا اگر مجاز ہوتا تو رکھتا "علی گڈھ کا پیام ندوہ کے نام" رشید صاحب نمائندہ علی گڈھ کے، آپ کی مجلس نائب و نمائندہ ندوہ کی۔ علی گڈھ اور ندوہ کے درمیان نہ وہ بیگانگی ہے نہ وہ دوری جو فرض کرلی گئی ہے۔ راہیں الگ ہیں، درمیانی منزلیں بھی الگ۔ لیکن دونوں کی ایک ہی منزل مقصود، اور وہ ہے ملت کی فلاح و بہبود! فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نے لائبریری اور لیبارٹری کو اپنایا، دوسرے نے اپنا دل محراب و منبر سے اٹکایا۔ ذرا سنئے کا فطرت بشری کے نباض اور انسانیت کے قیافہ شناس حضرت اکبرؔ کیا فرما گئے ہیں ؎

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع خو میں ہیں ٭ فرق اتنا ہے کہ اک جنگل میں ہیں اک زد میں ہیں

دونوں بزرگ حال ہی میں گزرے ہیں۔ آپ یقیناً واقف ہوں گے دونوں کے نام سے، دونوں کے کام سے، دونوں کے انجام سے، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک اگر آم تو دوسرے املی۔!

اور خیر شاعری کی طرف کیوں جائیے، واقعات ہی کی دنیا میں رہیے سہارنپور کے مشہور وکیل عبداللہ جان مرحوم بوڑھوں کو اب بھی یاد ہوں گے عقائد میں علماء دیوبند کے حلقہ بگوش، لیکن ظاہر کی تراش خراش میں بالکل سرسید ہی کی طرح سوٹ پوش! انھیں بھی چھوڑیئے، ہمارے مخدوم و مکرم مولانا حبیب الرحمٰن شروانی صدر یار جنگ ایک طرف علی گڈھ سے واصل، دوسری طرف اکابر ندوہ میں شامل! اور خود علامہ شبلی نعمانی مرحوم و مغفور کیا تھے؟ کیا کچھ علی گڈھ سے لے کر آئے اور کیا کچھ ندوہ کو دے کر گئے! پیام دینا تو ندوہ کا کام تھا، وہ خوش ہو کہ آج اُسے دوسرے کا پیام سُننے کی توفیق ہو رہی ہے "گفتِ حق" سے کچھ کم نعمت یہ "شنودِ حق" کی بھی نہیں!

مقالہ کو شروع سے آخر تک سُن لینے کے بعد کس میں ہمت رہ جائیگی جو علی گڈھ کو مخاطب کر کے کہہ سکے "الیس منکم رجل الرشید"

سیرت کی تعمیر:

ہر تعمیر سے مشکل سیرت کی تعمیر ہے اس لئے کہ اس میں تعمیر کرنے والے ہی کے ارادہ، کوشش اور خیرخواہی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ جس پر تعمیر کا عمل وارد ہوتا ہے اس کی گوناگوں صلاحیتوں اور ان کی کمزوریوں اور انکسار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے آپ جو عمارت جس طرح چاہیں بنانی شروع کردیں وہ بے چون و چرا بنتی چلی جائے گی لیکن کسی شخص کے مزاج اور اطوار کو کسی خاص نہج پر ترتیب دینا اور اس میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔

جامد اور بے جان اشیاء کو آپ اپنی مرضی کے مطابق توڑ موڑ سکتے ہیں۔ لیکن باشعور شخص کے نفسیاتی و انفرادی میلانات کو بڑی دقتوں ہی سے اپنی پسند کے کسی خاص سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے کالج کی مسجد کو قبلہ رُخ بنایا۔ اس کو بننے کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نمازیوں میں ہر نمازی کا باطنی رُخ بھی مسجد کی طرح قبلہ کی طرف رہتا ہوگا۔ وہ جس طرح قبلہ رُخ رہنے پر مجبور ہے اسی طرح نہ رہنے میں بے بس ہے۔ ایک طرف وہ مذہب اور معاشرے کی ذمہ داریوں کا پابند ہے۔ دوسری طرف جسم و جان کے مطالبوں کا شکار۔ معلمان اخلاق و مذہب اور ارباب حکومت و اقتدار اس فکر میں رہتے ہیں کہ انسان کے فطری میلانات کو کیا رُخ اور رفتار دی جائے۔ اس رخ و رفتار کے اعتبار سے افراد کی سیرت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ ارباب مذہب و اخلاق چاہتے ہیں کہ انسان اقدار کا پابند رہے۔ ارباب حکومت اس فکر میں رہتے ہیں کہ آدمی کو کس طرح اغراض کا وسیلہ بنایا جائے۔ اغراض بھی وہ جو مطلق العنان حکومت کے ہوں صالح اور صحت مند معاشرے کے نہیں۔

ہر خیر کا سرچشمہ مذہب ہے اور ہر وہ عمل خیر ہے جو انسان کی بھلائی اور برگزیدگی میں معین ہو۔ اسی عمل خیر سے ہم مسلمان اپنے خدا اور رسول کی تصدیق اور ان کی بڑائی کا اقرار و اعلان کرتے ہیں۔ سیرت کی تشکیل میں سب سے اہم اور سب سے بڑا درجہ عقیدہ کا ہے۔ اس کے عمل کا۔

مسلمان کی سیرت کی تعمیر کا مسئلہ ہو یا کسی اور کی سیرت کا سب سے بڑے خدا کا تصور اور سب سے بڑے انسان کا نمونہ سامنے رکھے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے بعد ہر شخص یا جماعت کو آزادی ہے کہ وہ اس کا انتخاب کرے کہ اس کا سب سے بڑا خدا اور سب سے بڑا انسان کون ہے، کیا ہے اور کہاں ہے ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے دنیا اتنی ترقی کرچکی ہے کہ اب اس کو سب سے بڑا خدا اور سب سے بڑا انسان ڈھونڈنے اور پالینے میں تنی دقت ہرگز نہ ہوگی جتنی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ہوئی تھی۔

اساتذہ کرام سے:

یہ مسئلہ ندوہ کے اساتذہ کرام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے مثلاً جہاں دینی اور مذہبی علوم کی تعلیم بطور خاص دی جاتی ہے اور طلباء کے معیار زندگی کو اونچا رکھنے کا لحاظ نہیں کیا جاتا، وہاں اس کا بڑا خطرہ رہتا ہے کہ طلباء زندگی اور زمانے کے بہت سے ناگزیر تقاضوں سے ناآشنا رہ جائیں اور ان کا شمار ایک خاص طرح کے افراد یا جماعت میں ہونے لگتا ہے۔ جن کو معاشرے میں کوئی قابل فخر حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ پہلے کبھی یہ صورت حال عام تھی اور نظر انداز کی گئی جس کا خمیازہ بھی ہم بھگتتے آرہے ہیں۔

اس کی طرف توجہ نہ دینا ناقابل معافی اور ناقابل تلافی غلطی ہوگی۔ دینی اور مذہبی تعلیم کو حتی الوسع اتنا روزی کمانے کا نہیں جتنا اخلاق و عادات کو سنوارنے کا وسیلہ بنانا چاہیئے دراصل مذہب معاشرے میں علماء کی اہمیت ہے پروہت کی نہیں۔ اس لئے فرصت کے لمحوں میں علماء کو حکومت سے اور پروہت سے عوام کو محفوظ رہنے کی دعا مانگا کرتا ہوں۔ سیرت سازی کے منصوبے میں اس قباحت کا پورے طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے۔

ندوہ کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم، تحقیق، تصنیف یا تبلیغ کا چاہے جیسا پروگرام ہو ان کو اس قابل بھی بنانا پڑے گا کہ خیر و شر، ہار جیت اور عمل و ردعمل کی اس عجیب لیکن عظیم دنیا میں وہ صرف عجیب نہ رہ جائیں عظیم بھی بن سکیں۔ اس کے لئے آپ کو دارالعلوم کی تمام کھڑکیاں اور طلباء کے ذہنی دریچے کھلے رکھنے پڑیں گے۔ اساتذہ کے لئے یہ بڑی دشواری اور ذمہ داری کا کام ہے، لیکن نوجوانوں کی سیرت کی تعمیر اور ان کی شخصیت کی تزئین میں اس سے عہدہ برآ ہونا پڑیگا۔

تقویٰ سے سیرت کو نمود اور شخصیت کو نکھار ملتی ہے:

سیرت کا اظہار شخصیت میں ہوتا ہے اور شخصیت ہی شخص کی خودی یا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ شخصیت نہیں تو شخص بھی نہیں۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ شخص کے حسب و نسب کا انحصار اسکے منصب معاش و ملکیت اور خاندانی شجرہ پر اتنا نہیں ہوتا جتنا اس کی شخصیت پر۔ اسی لئے اسلام میں شخص کی بڑائی کا مدار پیدائش پر نہیں تقویٰ پر ہے تاکہ ہر شخص کو اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کا یکساں موقع ملے۔ تقویٰ سے سیرت کو نمود اور شخصیت کو نکھار ملتی ہے اس سے انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے جو شخصیت کی نگہداری اور نمائندگی کرتی ہے۔

شخصیت کا انحصار ایثار پر ہے تن آسانی پر نہیں ـــ فرائض کی بجاآوری پر ہے ـــ فرائض کی خانہ پری پر نہیں ـــ

رشید صاحب ایک زندہ جاوید ادیب ہیں۔ ہندوستان میں ان کا تعارف مزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔ طنز نگاری اصناف ادب میں نازک ترین چیز ہے۔ اگر ایک ادیب کا مزاج صحیح طور پر ادا شناس نہیں، اور اس کی نزاکت سے واقف نہیں تو اس کی تحریر میں ابتذال و تجاوز پیدا ہوسکتا ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں میں مزاح کو نازک ترین، دشوار ترین صنفِ سخن سمجھا گیا ہے۔ رشید احمد صاحب نے اس میں کامیابی و کامرانی کے جو نقوش مرتسم کئے ہیں وہ انمٹ ہیں ـــ میری بد ذوقی کہیئے یا میرے ذوقِ جستجو کی کمی، یا رشید صاحب اس داد کو بیداد پر محمول کریں یا اس کو میری جرأت پسندی کہیئے میں ان کی مزاح نگاری کا جتنا قائل اور اس سے جتنا گھائل ہوں اس سے زیادہ ان کی حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوں، سراپا نویسی، تصویر کشی کے اعتبار سے گنجہائے گرانمایہ رشید صاحب کی شاہکار کتاب ہے، یہ کتاب نفسیات کی باریکیوں کے اعتبار سے بھی ایک مقام رکھتی ہے۔ رشید صاحب کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک درد مند دل دیا ہے ان کا زندگی سے قریبی تعلق ہے وہ اس کی دھڑکنوں کو سُنتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں اس کو بلا پس و پیش کے پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے بغیر ادب اُردو کا قافلہ جس لمحہ کاری کی طرف بڑھ رہا ہے اس سے میں بہت خائف ہوں۔ رشید صاحب نے "عزیزانِ ندوہ کے نام" میں اپنی وسعتِ فکر، دماغی توازن اور ایک ادیب میں جو انصاف ہونا چاہیئے تھا اس سے کام لیا ہے۔ ایک ادیب میں یہ چیز ناگزیر ہے اس لئے کہ وہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب وہ ہے جس کو کوئی خرید نہ سکے، رشید صاحب کا علی گڈھ سے دماغی و قلبی تعلق رہا ہے اور اس کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں سماگئی ہے اسی لئے چاہے عقائد پر بحث کر رہے ہوں یا علم کلام پر یا تاریخ پر یا ادب پر یا فلسفہ پر، علی گڈھ کا ذکر خیر ضرور ملے گا۔ یہ ایسا جام ہے جو چھلکے بغیر نہیں رہ سکتا، علی گڈھ اور ندوہ کا جو تعلق ہے، اس سے آپ واقف ہیں۔ شبلیؒ و سلیمانؒ کو علی گڈھ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ رشید صاحب کے لئے کڑی آزمائش کا وقت تھا کہ ندوہ تحریک پر لکھیں اور کسی قسم کی بے اعتدالی و حق تلفی نہ ہو۔ مگر وہ بڑی روانی اور احسن طریقے سے اس سے عہدہ برآ ہوئے مجھے تعجب ہے کہ پروفیسر رشید صاحب نے اتنی دور بیٹھ کر ایسا جاندار مقالہ سپرد قلم فرمایا یہ ان کی عمیق فکر کا نتیجہ، نہیں تو اور کیا ہے۔

(مولانا ابوالحسن علی ندوی)

آپ نے ایسے اشخاص دیکھے ہونگے جو تمام عمر مذہب، علم، اخلاق اور اعمال فاضلہ سے وابستہ رہے ہوتے ہیں لیکن ان مشاغل حسنہ کی کوئی خصوصیت یا امتیاز نہیں ملتا۔ آپ ان سے مل کر یہ نہ محسوس کریں گے کہ مذہبی یا علمی شخصیت سے دوچار ہیں جس کی روشنی دل آسانی اور گرانی آپ میں غیر شعوری طور پر نفوذ کر رہی ہے۔ کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ حضرت حسن بصریؒ خاموش بھی رہتے تھے تو اردگرد کے لوگ صرف ان کو دیکھ کر اپنے اپنے طور پر اخلاقی فضائل سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

آپ نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جن کے تمام اعضا، فرداً فرداً سجل اور دیدارو ہوتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ خوش شکل نظر نہیں آتے جیسے اعضا میں وہ ہم آہنگی نہ ہو جس کو حسن نازیبائی کہتے ہیں۔ ایسا شخص کتنا بدنصیب ہوگا جس کو ہر عضو خوبصورت دیا گیا ہو لیکن مجموعی طور پر نالائق یا غبی نظر آئے اس کے برخلاف بعض اَن پڑھ فلاکت زدہ کسان اور محنت کش ایسے ملیں گے جن کا سابقہ تمام عمر شیوں، ناموافق موسموں اور فصلوں، نالائق زمینداروں، ناسازگار حالات اور ہم نقصان دیرینہ یعنی افلاس و ادبار سے رہتا ہے، ہاتھ پاؤں، چہرہ مہرہ بھی اسی کے مطابق ہوگا لیکن ان کو دیکھ کر فی الفور اس کا احساس ہوگا کہ ان میں انسانیت، انفرادیت اور شخصیت ہے۔ ہم اپنی قیمتی سے قیمتی متاع ان کی امانت میں دے سکتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد بالخصوص ایسے ادارے میں جیسا کہ ندوہ ہے، اسی انسانیت، انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر اور تزئین ہے۔

دوستوں کا انتخاب:

اس کے علاوہ آپ کو اپنے ساتھیوں میں سے بھی ایسے دوستوں کو انتخاب کرنا پڑے گا جن کے ذہن کی بلندی اور اخلاق کی استواری اور پاکیزگی مسلّم ہو۔ طالب علموں کی زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے میں کالج کے ساتھیوں کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ والدین آپ کے ساتھ نہیں ہوتے۔ اساتذہ سے محدود اور مخصوص اوقات میں سابقہ ہوتا ہے۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہنسنا بولنا، بحث مباحثہ کھیل اور تفریح ایک دوسرے کے رنج اور راحت میں شرکت، آرزوؤں کی فراوانی، کچھ کر دکھانے کا حوصلہ، اعتبار و اخلاص کی یہ زندگی اچھے بورڈنگ ہاؤس اچھی تعلیم گاہ اور ان کی اچھی روایات ہی میں نصیب ہوتی ہے اور آپ خود خیال کرسکتے ہیں کہ آپ کی سیرت سنوارنے میں ان عوامل کا کتنا بڑا حصہ ہوسکتا ہے۔

خدا اور دوست کے انتخاب میں بڑی احتیاط اخلاص و احترام سے کام لینا چاہیئے۔ اس بیان میں بے باکی محسوس ہو تو معاف کر دیجئے، لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیے گا کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر میں خدا پر یقین اور دوست کی رفاقت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

آئندہ زندگی:

اس وقت اور یہاں آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ آئندہ زندگی عزت اور اطمینان سے گذارنی ہے تو ابتک ہم جس طرح بسر کرتے آئے ہیں اس پر سختی سے نظر ثانی کرنا پڑے گا ـــ ابتدا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کرنی پڑے گی کہ ایک نامعلوم مدت تک بے حد عزم محنت و مشقت کی زندگی ڈسپلن کے ساتھ ہنسی خوشی راضی برضائے الٰہی رہ کر گذارنی ہے جیسے کوئی منظم اور بہادر قوم یا جماعت ایمرجنسی کا اعلان کرکے جنگ، قحط، وبا اور دیگر آفات ارضی و سماوی سے عہدہ برآ ہونے پر آمادہ ہوتی ہو۔

زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ایک طرف محنت، قابلیت، حوصلہ اور یگانگت سے کام لینا پڑیگا، تو دوسری طرف نہ صرف نامناسب عادتوں اور خواہشوں کو چھوڑنا پڑیگا بلکہ طرب و تفریح بہت سے ایسے مشاغل کو بھی جو زندگی کے معمولات بن چکے ہیں کلیۃً نہیں تو تقریباً ختم کرنا ہوگا۔

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ
علیہ الرحمۃ

(از: مولانا محمد منظور نعمانی)

☆

ہندوستان کا شاید کوئی لکھا پڑھا مسلمان نہ ہوگا جس نے مولانا دریابادی مرحوم کا نام نہ سُنا ہو اور ان کے کام سے کچھ واقف نہ ہو — ابھی ۶ر جنوری کو ایک طویل علالت کے بعد مولانا نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ، ووسع مدخلہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیآتہ۔

راقم سطور کو اس کا بے حد افسوس و قلق ہے اور رہے گا کہ اپنی موجودہ بیماری اور معذوری کی وجہ سے نہ تو مولانا مرحوم کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکا اور نہ ان کو آخری غسل دے سکا جس کی انہوں نے معلوم ہوا ہے کہ تمنا بھی فرمائی تھی یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید۔

جہاں تک یاد آتا ہے راقم سطور نے مولانا مرحوم کو پہلی بار اسی شہر لکھنؤ میں اب سے ۴۵-۴۶ سال پہلے حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا تھا میں مولانا موصوف کے پاس مقیم تھا۔ ایک صاحب مولانا سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ کھدر کی شیروانی پر گہرے براؤن رنگ کا کھدر ہی کا عبا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر کھدر ہی کی کشتی نما ٹوپی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر کسی نے بتلایا کہ یہ "صدق" کے ایڈیٹر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بی۔اے ہیں۔ نام برسوں پہلے سے سُنا تھا اور مضامین بھی رسالوں، اخباروں میں دیکھے اور پڑھے تھے لیکن زیارت کی نوبت جہاں تک یاد ہے اس سے پہلے نہیں آئی تھی۔

یہاں ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ۲۰-۲۱ء میں خلافت کی تحریک نے مسلمانوں پر جو غیر معمولی اور محیر العقول اثرات ڈالے تھے۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کالجوں، یونیورسٹیوں کے سیکڑوں گریجویٹس نے پوری مولویانہ داڑھیاں رکھ لی تھیں اور کوٹ پتلون اُتار کر کھدر کی شیروانی اور اس کے اوپر کھدر ہی کا عبا پہننا شروع کر دیا تھا۔ یہ غالبًا مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا اثر تھا انہوں نے یہی لباس اختیار فرما لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے بھی اسی زمانہ میں عبا پہننا شروع فرمایا ہوگا۔ جو قریبًا آخر تک اُن کا معمول رہا۔

لکھنؤ کی اس پہلی ملاقات کے بعد غالبًا اگلے ہی سال بریلی سے "الفرقان" جاری ہوا اور مولانا کا ہفتہ وار اخبار "صدق" پابندی سے مطالعہ میں آنے لگا اُس وقت سے مولانا سے واقفیت بڑھی اور ان کی یہ خصوصیت پوری طرح علم میں آئی کہ دین کے بارے میں وہ کتنے حساس اور باحمیت ہیں اور مغربی تمدن و معاشرت اور مغربی فلسفہ کے کتنے بڑے اور کیسے محقق ناقد ہیں — اسی دور میں مولانا سے تعلق بڑھا اور کبھی کبھی خط کتابت بھی ہونے لگی۔

اب سنہ تو یاد نہیں اسی کے قریبی زمانہ میں غالبًا مولانا ہی کے ایماء سے دریاباد کے کچھ مسلمانوں نے تقریر کے لئے دریاباد مجھے مدعو کیا۔ مولانا نے سفارشی خط بھی لکھا۔ میں نے اسی لالچ میں یہ دعوت منظور کر لی کہ اطمینان سے مولانا سے ملاقات کا موقع مل جائے گا وہاں پہونچ کر مولانا ہی کے یہاں قیام ہوا اور انھیں کا مہمان بنا۔ بڑی عنایت فرمائی — صبح چائے ناشتہ سے فارغ ہو کر فرمایا۔ "میرا روزانہ کا معمول یہ ہے کہ اس وقت سے لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے الگ بیٹھ جاتا ہوں، دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھاتا، ظہر کی نماز کے لئے اُٹھتا ہوں اور ظہر کے بعد عصر تک پھر اپنے کام میں لگا رہتا ہوں اس وجہ سے دوپہر کے کھانے میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہو سکوں گا اس میں آپ مجھے معذور سمجھیں۔ اب انشاء اللہ عصر کی نماز کے وقت ملاقات ہوگی اور اس کے بعد پورے اطمینان سے بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔" مولانا کی اس بات سے میرے دل میں اُن کی قدر و عظمت اور زیادہ بڑھ گئی در اصل وہی شخص زندگی کا قدرشناس اور کامیاب ہے جو اپنے وقت کی قدر کرے اور اللہ کی دی ہوئی اس نعمت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ کام لے لے۔ ہمارے اکابر میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی میں امتیاز رکھتے تھے۔ یہ عاجز وہاں کے اصولوں سے کچھ واقف تھا اور اس طرز عمل کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس لئے مولانا دریابادیؒ کی اس بات کا مجھ پر اچھا ہی اثر پڑا۔

عصر کے بعد اطمینان کے ساتھ بیٹھنا ہوا اور اس صحبت میں مولانا نے اپنی کچھ سرگزشت سُنائی جس کا خلاصہ یاد رہ گیا ہے۔ بتلایا کہ میرا گھرانہ الحمد للہ اچھا دیندار اور مذہبی گھرانہ تھا۔ والد ماجد[1] راسخ العقیدہ دیندار تھے لیکن گھر کے اس ماحول کی وجہ سے میرا حال بھی الحمد للہ شروع ہی سے اچھا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مغربی تعلیم اور فلسفہ کے اثر سے میں "بے یقینی بلکہ الحاد" تک پہونچ گیا۔ میرے والد ماجد مرحوم قدرتی طور پر اس سے بہت متاثر اور متفکر تھے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے ان کا اچھا تعلق تھا۔ میری بھی اُن کے ہاں کبھی کبھی آمد و رفت ہوتی تھی۔ والد صاحب میرے بارے میں ان کو بھی لکھتے تھے۔ میں جب الٰہ آباد ان کی خدمت میں جاتا تو بڑے حکیمانہ انداز میں میرے خیالات کی اصلاح کی کوشش کرتے ایک دفعہ میں ان کے یہاں پہونچا تو انہوں نے مجھے "مثنوی مولانا روم" مطالعہ کے لئے دی جو غالبًا اسی زمانہ میں بہت خوبصورت چھپ کر آئی تھی۔ مولانا دریابادی نے بتلایا کہ الحاد و مادیت سے روحانیت اور خدا پرستی کی طرف میرے ذہن کو سب سے پہلے "مثنوی" کے مطالعہ نے موڑا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل بہ منزل مزید توفیق اور رہنمائی ملتی رہی۔ اسی صحبت میں مولانا نے اپنے ابتدائی دور کا ایک فوٹو بھی کھلا دیا اگر مولانا خود نہ بتلاتے تو ہرگز یقین نہ آتا کہ یہ تصویر اُن کی ہو سکتی ہے۔

مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ایک مولانا محمد علی مرحوم اور دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ۔ حضرت تھانویؒ سے ان کے تعلق کی تاریخ اور تاثر کی پوری نوعیت ان کی کتاب "حکیم الامت" سے معلوم ہو سکتی ہے۔

مولانا نے اتنا لکھا کہ ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی نے اتنا لکھا ہو، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے۔ چونکہ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور خاص کر یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور توراۃ و انجیل وغیرہ صحف قدیمہ کی شروح اور ان سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کا انہوں نے خاص اہتمام فرمایا تھا اس لئے ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسری تفسیروں میں نہیں ملتیں اور قرآن پاک کے سمجھنے میں اُن سے بڑی مدد اور رہنمائی ملتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا کی یہ تفسیر ان کی نظر ثانی کے بعد صرف گیارہ پارے تک ان کے سامنے شائع ہو سکی لیکن مولانا مرحوم اب سے بہت پہلے نظر ثانی کا کام پورا کر چکے تھے۔ خدا کرے باقی حصے بھی جلد چھپ کر طالبان علوم قرآن کے ہاتھوں میں آ جائیں۔

معلوم ہوا ہے کہ اردو تفسیر کے علاوہ مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر پر بھی نظر ثانی کا کام پورا کر لیا تھا لیکن اس کا کوئی حصہ شائع نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ اس کی طباعت و اشاعت کا کوئی سامان بھی غیب سے پیدا فرمائے۔ وما ھو علیہ بعزیز۔

دوسرے بہت سے علماء و مصنفین کی طرح

(بقیہ ص پر)

[1] مولانا کے والد ماجد کا اسم گرامی عبد القادر تھا عہدہ کے لحاظ سے ڈپٹی کلکٹر تھے بکہ معظمہ میں عین ایام حج میں وفات پائی اور مولانا کے دادا اپنے دور کے ممتاز عالم مفتی مظہر کریم تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور اس کی وجہ سے دوسرے متعدد علماء کرام کے ساتھ ان کو بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔

سات لاکھ سے زائد افراد نے حج کیا۔

(محمود الازہار ندوی ایم۔اے)

اس سال بری، بحری اور فضائی راستوں سے حج ادا کرنے والوں کی کُل تعداد ۷۱۹۰۴۰ تھی ان میں فضائی راستے سے آنے والوں کی تعداد ۳۷۴۷۵۱ تھی۔ بری راستے سے آنے والوں کی تعداد ۲۶۳۳۸۳ تھی، اور بحری راستوں سے آنے والوں کی تعداد ۸۰۹۶ تھی۔ ان کا براعظمی گوشوارہ حسب ذیل ہے:—

عرب ممالک:

لبنان	۱۰۶۹	یمن	۶۱۱۱۰	تیونس	۷۵۳۸
شام	۲۴۴۴۶	الجزائر	۳۴۸۵۱	قطر	۸۴۷
مصر	۲۸۰۴۵	جنوبی یمن	۷۷۰۹۲	بحرین	۱۹۸۹
عراق	۴۹۷۰۳	الامارات المتحدہ	۴۱۹۶	صومالیہ	۷۵۰۸
سوڈان	۴۱۶۵۲				
لیبیا	۱۸۰۵۷	مراکش	۱۵۰۴۴	موریتانیا	۱۶۵۴
اردن	۲۳۴۲۷	فلسطین	۶۵۶		
عمان	۲۲۵۱	کویت	۴۹۰۸		

عرب ممالک کے حجاج کی مجموعی تعداد ۳۳۶۷۴۳

ایشیائی ممالک:

ترکی	۱۲۷۲۹۱	ملیشیا	۳۳۷۳	فلپائن	۳۵۷
ایران	۳۹۲۹۶	پاکستان	۴۸۳۲۷	تھائی لینڈ	۱۹۲
ہندوستان	۱۷۵۱۰	سری لنکا	۱۲۶	انڈونیشیا	۲۵۶۲۴
بنگلہ دیش	۴۴۹۰	برونی	۱۱۱	چین	۱۰۰
افغانستان	۸۳۰۸	سنگاپور	۴۳۴	دیگر ایشیائی ممالک	۲۳

ایشیائی ممالک کے حجاج کی تعداد ۲۸۴۵۶۲

عرب افریقی ممالک:

فرانسیسی مالیہ	۴۸۳	زائرے	۱۵۸	گھانا	۳۱۰۷
نائیجریا	۶۶۸۷۳	یوگنڈا	۲۴۹۱	توجو	۹۵
سینیگال	۴۱۴۸	تنزانیہ	۵۹۱	جنوبی افریقہ	۱۲۶۵
نائیجر	۱۳۵۹	کینیا	۶۹۱	آئیوری کوسٹ	۹۱۶
ایتھوپیا	۲۲۴۶	ڈھومی	۵۴۵	سیرالیون	۳۱۹
مالی	۲۰۷۲	لائبیریا	۹۸	ماریشیش	۳۱۵
وولٹا	۲۸۰۹	گیمبیا	۶۶۷	وسطی افریقہ	۳۶۱
کیمرون	۷۷۹	چاڈ	۱۳۹۲	موزمبیق	۴۷

زائرے	۱۵۸
دیگر افریقی ممالک	۸۸
جزر القمر	۱۳۱

غیر عرب افریقی ممالک کے حجاج کی مجموعی تعداد: ۹۴۳۸۰

امریکہ و یورپی ممالک:

امریکہ	۱۰۲	اسپین	۴	دیگر یورپی ممالک	۴۸
یونان	۱۴۴	فرانس	۵۶۳	دیگر ممالک	۸۸۲
یوگوسلاویہ	۸۵۵	برطانیہ	۷۵۷		

امریکہ و دیگر یورپی ممالک کے حجاج کی تعداد: ۳۳۵۵

غیر ممالک کے حاجیوں کی کل تعداد: ۷۱۹۰۴۰

شاہ خالد کا "منیٰ" کا محل وزارت صحت کے حوالہ: خالد بن عبد العزیز فرمانروائے سعودی عرب نے حجاج کی سہولت کی خاطر اپنے "منیٰ" کے محل کو وزارت صحت کے حوالہ کر دیا تھا کیونکہ حاجیوں کے لئے اسپتال تھے اور وہ ناکافی ہو رہے تھے اور اس قلت کو شاہی محل کے مل جانے کی وجہ دور ہو گئی تھی۔ اس کے لئے وزارت صحت نے طبی انتظامات کو قابل استفادہ بنانے کے لئے خود پر ۱۴ نئے مرکز بھی قائم کئے تھے۔

سیرت نبویؐ پر ½ ۱ لاکھ ریال کا انعام: رابطہ عالم اسلامی نے اپنے اجلاس میں اعلان کیا کہ سیرت نبویؐ کے موضوع پر اول پانچ کتابوں کو انعام دیے جانے کی منظوری دیدی ہے اور نمبر ایک پر آنے والی کتاب کو رابطہ خود اپنے صرفہ سے طبع کرائے گی اس کے لئے رابطہ نے ½ ۱ لاکھ رکھے ہیں اسکی تقسیم ذیل طریقے پر کی جائے گی۔

پہلا انعام: ۵۰ ہزار ریال۔ دوسرا انعام: ۴۰ ہزار ریال۔ تیسرا انعام: ۳۰ ہزار ریال۔ چوتھا انعام: ۲۰ ہزار ریال۔ پانچواں انعام: ۱۰ ہزار ریال۔

رابطہ نے اس کا اعلان سال گزشتہ کیا تھا اور اس کی آخری تاریخ محرم ۱۳۹۷ھ تک مقرر کی تھی رابطہ نے اس کتاب کے لئے کوئی زبان کی تخصیص نہ کی تھی بلکہ اس نے اسکے لئے دنیا کی اہم زبانوں میں اس کتاب کو طلب کیا تھا اور سلیکشن کمیٹی دنیا بھر کے چیدہ اور مختلف زبانوں پر عبور رکھنے والے علماء پر بنائی گئی تھی۔

یہ کمیٹی سات افراد پر بنائی گئی ہے۔ ان میں ہندوستان سے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور پاکستان سے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مذہبی امور کے وزیر مولانا کوثر نیازی ہیں۔ اسکے علاوہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود مصر سے اور سعودی عرب سے اعلیٰ تعلیم کے وزیر شیخ حسن عبد اللہ آل شیخ اور شیخ عبد اللہ بن حمید مسجد حرام کے دینی امور کے کمیٹی کے صدر اور مجلس قضاء کے چیرمین اور شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز ادارہ بحوث علمیہ اور افتاء اور دعوت ارشاد و تبلیغ کے صدر پر مشتمل۔